داستانِ امیر حمزہ

شینواری

گفتگو:
خاطر غزنوی

سنڈیکیٹ آف رائٹرز (رجسٹرڈ) پاکستان پشاور

امیر حمزہ شنواری کی زندگی کے مختلف ادوار تصاویر میں

تصاویر از: خاطر غزنوی

تصاویر کے جملہ حقوق بنام مولف محفوظ ہیں
کسی کو شائع کرنے کی اجازت نہیں
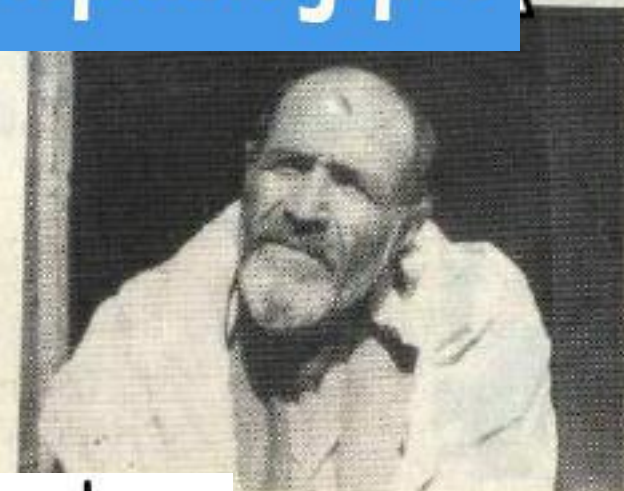
ضابطہ

نام کتاب	......	داستان امیر حمزہ (شنواری)
گفتگو	......	خاطر غزنوی
اشاعت	......	بار اول ۱۹۹۶ء
تعداد	......	پانچ سو
کمپوزنگ	......	مسعود سمیع
پریس	......	منظور عام پریس پشاور شہر
ناشر	....	... (رجسٹرڈ) پاکستان
	....	
انصرام	....	

ملنے کا پتہ

تاج کتب خانہ
قصہ خوانی، پشاور شہر

دارالادب
لیاقت بازار پشاور صدر
فون نمبر 273229

حمزہ بابا کی متصوفانہ غزل

رواں ہوں اپنی طرف اور نامہ بر بھی میں
میں مبتدا بھی خود اپنا ہوں اور خبر بھی میں

میں پانیوں کی طرح بے نیاز ضرب رہا
کہ خود ہی زخم بھی مرہم بھی چارہ گر بھی میں

میں آپ جوہر گم کردہ آئینے کا ہوں
ہوں خود ہی محو نظارا بھی ' بے بصر بھی میں

ازل کے خواب کو ہے انتظار صبح ابد
عیاں ہے یہ کہ رہا اپنا منتظر بھی میں

سپند دل مرا رقصاں ہے سوز الفت سے
بری نظر بھی ہوں میں ' بجمر و اثر بھی میں

جہاں کے خواب میں گم ہوں مگر نہیں ہوں گم
میں آپ اپنی ہی منزل ہوں اور سفر بھی میں

سراب جاں بھی ہوں میں اور پائمال بھی آپ
تمام تشنہ لبوں کو ہوں رود تر بھی میں

(ترجمہ : خاطر غزنوی)

حرف آغاز

امیر حمزہ شنواری ___ جدید دور میں پشتو زبان و ادب کی ایک عظیم شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں- وہ ایک مثمن ہیرے کی طرح ہیں جس کا ہر پہلو ہزار رنگ اور چمک کا حامل ہے- شاعر کے طور پر ان کو بڑے بڑے پشتون اہل قلم نے صاحب کمال مانا' اور انہیں رئیس المتغزلین اور شہنشاہ غزل تسلیم کیا۔ وہ پشتو کے جدید دور میں ڈراما نگاری کے فن میں آگے آگے رہے- آل انڈیا ریڈیو سے ریڈیو پاکستان اور فلمی دنیا سے ٹیلی وژن تک ان کے ڈرامے مقبول و معروف ہوئے۔ اردو شاعری سے انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اہل زبان سے داد و تحسین حاصل کی۔ لیکن ان کی زندگی کا اہم ترین پہلو ان کی متصوفانہ زندگی تھی- جس کے سارے پر پیچ راستوں سے وہ گذرے۔ وہ وجودی تصور تصوف کے داعی تھے -ان کا تصوف محض ان کی زندگی پر ہی عکس ریز نہ تھا بلکہ ان کے فن کا حصہ بھی بنا ان کی غزل 'ان کا ڈراما بھی تصوف کی ترجمانی کرتا ہے۔ انہوں نے تصوف کا بڑا گہرا علمی اور عملی مطالعہ کیا۔ انہوں نے شاعری اور ڈراما نگاری کے علاوہ ناول بھی لکھا۔ پشتون ثقافت بھی کو متعارف کیا۔ بڑے بڑے علمی اور تعلیمی سیمیناروں میں بھی شرکت کی۔ غرض وہ جدید دور کے ایک بے بدل انسان تھے۔

زیر نظر کتاب ان کی پوری زندگی ،فن ' ان کے فنی اور دوسرے رجحانات اور عقائد اور زندگی کے تجربات کا احاطہ کرتی ہے۔ اور مجھے فخر ہے کہ ان کی زندگی کے حالات ان کی زبانی حاصل کر کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

امید ہے قارئین اور تحقیق کے طالب علم ان کی زندگی ' خیالات و عقائد اور فنی کو الگ الگ کماحقہ فائدہ اٹھائیں گے۔

داستان امیر حمزہ

سوال 1:- داستان امیر حمزہ سے ہمیں بھی مستفید فرمائیے-

میں 1907ء میں ستمبر کے مہینے میں بمقام لنڈی کوتل خیبر میں پیدا ہوا- میرے والد کا نام ملک باز میر خان تھا- اپنے قبیلے کے مخیر انسان تھے- حسن نیت اور شگفتہ مزاجی ان کی خصوصیت تھی- نشانہ بازی میں ید طولی رکھتے تھے-

مجھے غالباً" 1916ء میں لنڈی کوتل کے پرائمری اسکول میں داخل کیا گیا- ان دنوں پہلی جنگ عظیم زوروں پر تھی- زمیندار اخبار آیا کرتا تھا اور اس میں مقتولوں کے نام بھی ہوا کرتے تھے- میرے ایک اپنے بڑے بھائی خلیل خان بھی نمبر 20 پنجابی پلٹن ہیں ملازم ہو کر عراق کے محاذ پر بھیج دیئے گئے تھے- وہ ہم پانچ سگے بھائیوں میں چوتھے تھے اور میں سب سے چھوٹا' وہ والد صاحب سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تھے اور پھر جہلم سے پلٹن میں بھرتی ہو کر سپاہی بنے تھے معمولی پڑھے لکھے تھے- بعد میں بیماری کی وجہ سے فوج سے خارج ہو کر گھر آگئے تھے- 1949ء میں وفات پائی-

میں جب سکول میں داخل ہوا اس وقت سکول قلعہ لنڈی کوتل کے اندر محکمہ پولیٹکل کے ایک کمرے میں تھا- ہمارے استاد پشاور کے رہنے والے تھے اور جب میں تختی پر پٹی لکھنے کے قابل ہوا تو ایک دن خدا جانے فطرت کے کون سے گوشے میں ایک تحریک اٹھی کہ تختی پر پٹی کے بجائے انسانوں کے خاکے بنا دیئے اور جی ہی جی میں خوشیاں منانے لگا کہ استاد اسے دیکھ کر بڑی شاباشی دیں گے- مگر میری توقع کے خلاف استاد صاحب نے اپنا بید اٹھایا اور بے رحمی سے پیٹنے لگا-

میرے ایک ہم وطن مسی گل زئے جو چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اور ہمارے ہمسایہ میں رہتا تھا - میری چیخ و پکار زیادہ دیر تک نہ سن سکا - اس نے دوڑ کر استاد کا ہاتھ پکڑ لیا - استاد نے اسے غصہ کی نظر سے دیکھا مگر گل زئے نے اسے ایک دھکا دے کر کرسی پر گرا دیا اور غضب ناک ہو کر کہا "ظالم انسان یہ تو نے کیا کیا - کیا ایسے معصوموں کو اس طرح بے رحمی سے پیٹنا انسانیت ہے - خدا کی قسم اگر تم نے پھر ایسی حرکت کی تو جان سے مار ڈالوں گا اس زمانے کے استاد چونکہ ترقی یافتہ نہیں تھے - وہ اس طرح شاگردوں سے پیش آتے تھے - لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے پڑھنے سے وحشت ہونے لگی - اس پر متضاد یہ کہ ذریعہ تعلیم اردو تھی پہلے یہ پڑھتے تھے کہ "ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے - باپ حقہ پی رہا ہے" اور پھر پشتو میں اس کے معنی بتائے جاتے تھے - جس سے ذہن پر شدید رد عمل ہوتا تھا - چنانچہ میں سکول سے غیر حاضر رہنے لگا گھر سے بستہ لے کر نکل آتا مگر قلعہ لنڈی کوتل کے شمالی بازو کے پاس قبرستان کے اندر یا تو مزار سید امیر بادشاہ کے پاس چھپا بیٹھا رہتا یا اپنی والدہ کی قبر کے پاس پڑ کر سو جاتا جو اسی مقبرہ میں واقع ہے اور میرے بھائی خلیل خان نے مجھے دکھائی تھی - مجھے یاد ہے کہ جب میرے والد کا انتقال ہوا تھا میری عمر اس وقت تین برس سے کم تھی میں ان کی میت سے لپٹ کر روتا تھا اور میرے ساتھ میں میرے بڑے بھائی ملک بلجی خان بھی روتے جاتے تھے - پھر انہوں نے خلیل خان سے کہا کہ اسے باہر لے جاؤ چنانچہ وہ مجھے باہر لے کر اپنے ایک عزیز عظمت اللہ خان کے حجرے میں گئے اور میرے ساتھ ایک چارپائی پر لیٹ گئے اور مجھے تھپک تھپک کر سلایا اور جب میری آنکھ کھلی تو وہ جا چکے تھے میں حجرے سے باہر آیا تو گاؤں کے دروازے سے والدہ کا جنازہ نکلا اور میں دوڑ کر قریب گیا اور روتے ہوئے کہنے لگا "میری ماں کو کہاں لے جا رہے ہو" میری چھٹی حس کو معلوم ہو گیا تھا کہ جنازہ میری والدہ کا ہے - بھائی خلیل خان نے مجھے گود میں لے کر کہا "ماں بیمار ہے اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں" اور بعد میں یاد نہیں کہ کیا ہوا میرا حافظ

اس بلا کا تھا کہ والدہ کی وفات کو تو خیر چھوڑ دیجئے کیونکہ اس وقت میں کافی ہوشیار تھا مجھے اس وقت کی باتیں اور واقعات بھی ابھی تک یاد ہیں جبکہ میری عمر ایک برس کی بھی نہیں تھی -

میرے ایک بھائی یار محمد خان جو بلجی سے چھوٹے اور بادر خان و خلیل خان سے بڑے تھے سواروں میں ملازم تھے اور جب کبھی قلعہ لنڈی کوتل سے گھر آتے تو کبھی کبھی سرکاری گھوڑے پر ہی سوار ہو کر آتے - چنانچہ ایک دن میں گھر کے آنگن میں زمین پر ادھر ادھر گھسٹ رہا تھا کیونکہ ابھی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کہ یار محمد خان گھوڑے پر سوار ہو کر اندر آگئے - وہ لمبے قد اونچی اور فراخ پیشانی کے نوجوان تھے اور اپنے وقت کے بہترین شاعر تھے لیکن افسوس کہ ان کا کلام نہ مل سکا ان کا صرف ایک چار بیتہ اور وہ بھی نامکمل - میرے لڑکے مراد نے کہیں سے مہیا کر کے اپنی کتاب "ذخیرہ ادب" میں شائع کیا ہے مراد قد و قامت اور چہرے مہرے کے لحاظ سے یار محمد خان سے زبردست مشابہت رکھتا ہے چنانچہ جب یار محمد خان گھوڑے پر سوار اندر آگئے اور مجھے دیکھا تو گھوڑے کی زین سے جھک کر مجھے اٹھایا اور اپنے سامنے زین پر بٹھا دیا - اور جس دالان (اب چھوٹا سا کمرہ بن گیا ہے) وہ گھوڑے کو کھڑا کرتے تھے - اس میں خود تو گھوڑے سے اتر کر چلے گئے اور مجھے زین پر چھوڑ دیا چنانچہ میں نے نیچے دیکھتے ہی خوف و ہراس کا احساس کیا اور بے تحاشہ چیخنے لگا - والدہ مرحومہ اس وقت تنور میں لکڑیاں ڈال رہی تھیں - گھبرا کر میری طرف دوڑیں اور مجھے گود میں لے کر یار محمد خان سے کہنے لگیں "کیا تم اندھے تھے کہ بچے کو زین پر چھوڑ دیا" یار محمد خان نے مسکرا کر کہا "ماں ذرا رہنے دیتیں کہ تگڑا ہو جائے" اور میں نے بھی خوف کا احساس کرتے ہوئے زین کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اس کے بعد مجھے یاد نہیں آتا کہ میرے بھائی یار محمد خان کب کابل گئے اور سرکاری گھوڑا بھی لے گئے -

بات یہ تھی کہ اس زمانے میں صاحبزادہ عبدالقیوم خیبر کے اسسٹنٹ

پولیٹکل آفیسر تھے اور میرے والد کے بے حد مخالف تھے مخالفت کی جو بھی وجوہ
ہوں لیکن دشمنی کی حد تک مخالف تھے۔ یار محمد خان نے اسے ٹھکانے لگانے کا
ارادہ کیا۔ اس وقت موٹر اور لاریاں نہیں تھیں۔ صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم پشاور
لنڈی کوتل کا سفر تانگے کے ذریعے کرتے تھے اس زمانے میں ڈاک بھی تانگوں کے
ذریعے ہوا کرتی تھی۔ میرے والد کو کسی نے یار محمد خان کے ارادے کی خبر دی
والد صاحب نے اسے بلا کر خوب زجر و توبیخ کی اور چند تھپڑ رسید کئے جس پر یار
محمد خان کابل فرار ہو گئے۔ امیر حبیب اللہ خان نے انہیں کپتان کا عہدہ اور زمین
دی۔ یہاں صاحبزادہ اور سرجارج روس کیپل نے میرے والد کو مجبور کیا کہ یار محمد
خان کو وہاں سے بلا لائے۔ چنانچہ والد صاحب نے بڑی مشکل سے بلایا۔ مجھے یاد ہے
کہ جب وہ واپس آئے تو بیمار تھے اور قبائلی علاقے کے روایتی علاج کے مطابق
بکرے کا پوست پہنے ہوئے تھے۔ قبائلی لوگ ملیریا اور دیگر بخاروں کے لئے بکرے
کی کھال پہنتے ہیں اور چوٹ یا نمونیہ کے لئے دنبے کی کھال استعمال کرتے ہیں اور
چوبیس گھنٹوں کے بعد اتار دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ والدہ مرحومہ نے یار محمد خان
کی واپسی کی خوشی میں مٹھائی منگائی تھی اور لوگوں میں تقسیم کی تھی یار محمد خان کو
چھ ماہ قید کی سزا ہوئی اور سزا کاٹنے کے بعد وہ پھر واپس کابل چلے گئے اور وہاں
انہیں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ البتہ جب ان کا تابوت کابل سے
یہاں لایا گیا تو میں تین ساڑھے تین سال کا ہو گیا تھا وہ دن مجھے بخوبی یاد ہے۔

میری والدہ کی وفات کے بعد میری تربیت میری سوتیلی والدہ نے کی اور
بڑے بھائی ملک بلجی خان نے اپنی نگرانی میں رکھا میری سوتیلی والدہ جو میرے
چھوٹے بھائی محمد عمر خان کی سگی والدہ تھیں ہر وقت میرا خیال کرتیں۔ انہوں نے
مجھے یتیمی کے احساس سے قطعاً" بے خبر رکھا۔

میں سکول سے غیر حاضر رہنے لگا تھا اور آخر کار استاد نے میرے بڑے
بھائی کو میری غیر حاضری کی اطلاع دی۔ بڑے بھائی نے زجر و توبیخ کی۔ مگر والد

صاحب کی رائے یہ تھی کہ مجھے اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور میں داخل کرا دیا جائے
اس لئے کہ وہاں بورڈنگ میں رہنے کی وجہ سے سکول سے نہ بھاگ سکوں گا غالباً"
1918ء میں مجھے وہاں دوسری جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں تھرڈ ہاسٹل میں
رہنے لگا۔ جہاں آفریدی اور شنواری قوم کے طالب علم بھی تھے۔ ہمارے
شنواریوں میں سے ملک زادہ گلفذار مرحوم اور ان کے چچیرے بھائی ملک زادہ محمد
جانس خان جو تاحال بقید حیات ہیں موجود تھے گلفذار مرحوم ہاکی اور فٹ بال کے
بہترین کھلاڑی اور بے حد شریف النفس انسان تھے ان کے علاوہ راموش خان
شنواری بھی جو انہی کے عزیز تھے ساتھ تھے دوسرے آفریدیوں میں زیور خان و
قطب الدین خان مرحوم بھی تھے۔ موجودہ جنرل اعظم خان اور ان کے بڑے بھائی
اکرم خان اور چترال کا شہزادہ ناصر الملک مرحوم ان کے بھائی حسام الملک و نظام
الملک وغیرہ بھی تھے ان کے برابر کے کمروں میں شہزادہ جہانزیب سابق والئی سوات
اور ان کے چچیرے بھائی شاہ روم رہتے تھے۔ شاہ روم میرے ہم جماعت تھے۔ مگر
یہاں بھی پڑھائی میں جی نہیں لگتا تھا حالت یہ تھی کہ کپڑوں اور بستر میں جوئیں
پڑ گئیں اس لئے میاں جعفر شاہ مجھے چکن یعنی جوؤں سے بھرا ہوا کہا کرتے تھے۔
مولانا عبدالقادر مرحوم جب مڈل کے طالب تھے تو میں پانچویں میں پڑھتا تھا۔ میرے
لنڈی کوتل کے عزیز محمد شاہ شنواری جو بقید حیات ہیں مولانا عبدالقادر کے ہم
جماعت تھے۔ میں نے پانچویں جماعت میں شاعری شروع کی چونکہ ذریعہ تعلیم اردو
تھی اس لئے اردو میں لکھنے لگا۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ اشعار مجھے یاد نہیں رہے
کیونکہ میں انہیں محفوظ نہیں رکھا کرتا تھا اس کی تحریک شاید ہمارے ایک استاد
مرزا عباس علی بیگ صاحب کی شاعری سے ہوئی اضلاع متحدہ (موجودہ بھارت کا اتر
پردیش) کے رہنے والے تھے۔ چھ فٹ سے قد کسی قدر نکلتا ہوا۔ چھوٹی سی داڑھی
بڑے تن و توش کے آدمی تھے۔ نمازی اور شریف انسان تھے ہم انہیں جائنٹ ماسٹر
کہا کرتے تھے کیونکہ دیو کی مانند طاقت ور معلوم ہوتے تھے ہمارے ایک ساتھی

ارباب شیر اکبر خان مرحوم بھی تھے جو تکال بالا کے رہنے والے وہ بھی بھاری بھرکم وجود کے حامل تھے اس لئے ایک مرتبہ جناب مرزا عباس علی بیگ نے اسے دیکھتے ہوئے فی البدیہہ کہا تھا۔

چہرہ ہے مثل ببر
ہے نام شیر اکبر
رستم بھی تمکو دیکھے
تو بھاگ جائے ڈر کر

میں اردو میں ہمیشہ اول آتا تھا چنانچہ مرزا صاحب مجھے ڈبل اور کبھی ٹرپل "اے" دیا کرتے تھے مگر ایک دن ناراض ہو کر تمام دیئے ہوئے اے کو ڈی میں تبدیل کردیا اور فرمایا کہ کس منحوس کے بچے نے تجھے "اے" دیا ہے میرے منہ سے بے اختیار نکلا "آپ نے" فرمایا "بنچ پر کھڑے ہو جاؤ منحوس تمام دن کھڑے رہو۔"

اس زمانے میں علامہ مشرقی مرحوم اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہوا کرتے تھے اپ ٹوڈیٹ تھے۔ بیگم صاحبہ اگرچہ برقعہ پہنتیں مگر اکثر ساتھ ہی رہا کرتیں میں نے وہاں انہیں ایک دو دفعہ دیکھا تھا۔ بعد میں حافظہ سے اتر گئے تھے اور جب ہم 1938ء میں ریکارڈنگ کے لئے دہلی گئے تو ایک خاکسار صاحب کے ہوٹل میں رہائش پذیر ہوئے۔ ایک دن میرے ایک ساتھی معروف خان (حاجی معروف خان) نے کہا کہ تم نے دیکھا کہ یہ خاکی وردی والے مشرقی صاحب تھے میں نے کہا چلو ان کا سلام ہو جائے چنانچہ ہم چھ سات آدمی ان کیخدمت میں حاضر ہوئے۔ چنانچہ جناب مشرقی صاحب ایک پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے ان کے اردگرد سالار قسم کے دو تین احباب تشریف فرما تھے ہم نے سلام کرکے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے تو جناب علامہ مرحوم ہمیں صرف اپنے دائیں ہاتھ کی دو چار انگلیاں ہی پکڑاتے رہے جن پر اخوت و مساوات کے لیبل لگے ہوئے تھے جس پر میری طبیعت مشتعل

ہو گئی لیکن خاموش ہو رہا۔ وہ نہایت وقار اور تمکنت سے ہمیں دیکھتے رہے۔ پھر مجھے مخاطب کرکے فرمانے لگے "دیکھو جی' یہ عبدالغفار خان تمہیں ہندو بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور تم پٹھان اندھوں کی طرح اس کے اشاروں پر ناچ رہے ہو" میں تو ویسے بھی بھرا بیٹھا تھا جواب دیا "جناب اگر ہندوستان کے دوسرے لیڈر ہمیں کچھ اور بنانا چاہتے ہوں تو ہمیں کیا علم ہے۔ بظاہر عبدالغفار خان نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں" روئے سخن بدل کر فرمایا "پشاور میں کون سی پارٹی کا زیادہ زور ہے" میں نے کہا پارٹی تو بس ایک ہی ہے جسے انڈین نیشنل کانگریس کہتے ہیں اس کے سوا دوسری پارٹیوں کی حیثیت محض بارانی مینڈکوں کی ہے۔ ظاہر ہے میں غصے میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا ورنہ مجھے نہ تو خان عبدالغفار خان کی حمایت مقصود تھی اور نہ کانگریس کی کیونکہ ہم قبائلی لوگوں کا ان سیاسی پارٹیوں سے ذرہ بھر بھی تعلق نہ تھا چنانچہ اس بات پر انہوں نے اپنے سالاروں کی طرف مڑ کر گفتگو شروع کی اور ہم بغیر سلام کئے باہر آگئے۔

میرے زمانے میں اسلامیہ کالجیٹ سکول کا ہیڈ ماسٹر ایک جوان انگریز مسٹر واٹ کنگ تھا جو نہایت سخت سزا دیا کرتا تھا میں بہار کی چھٹیوں سے ایک روز پیشتر بھاگ گیا تھا واپس آنے کے بعد دو چار بید ایسے لگائے کہ ہاتھوں میں جو نیل پڑے تھے ہفتوں میں مندمل نہ ہو سکے واٹ کنگ کے بعد مسٹر ہاورڈ تشریف لائے' ادھیڑ عمر کے تھے مگر سزا یہ بھی دیا کرتے تھے۔ فرق اس قدر تھا کہ ان کے وار مسٹر واٹ کنگ کی طرح بھرپور نہیں ہوا کرتا تھا اور وار کرتے ہوئے خود بھی ڈگمگا جایا کرتے تھے ان کے بعد مرحوم شاہ عالم خان بحیثیت ہیڈ ماسٹر متعین ہوئے بے حد شریف' نرم مزاج اور ہمدرد انسان تھے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی طالب علم کو مارنے کے بعد بیمار پڑ جاتے تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد غالباً" ڈائریکٹر تعلیم اور آخر میں اباسین آرٹ کونسل کے نائب صدر رہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

ہمارے تھرڈ ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سید قمر علی شاہ صاحب تھے جن کے ڈنڈے سے طالب علم تھرا جاتے پشتو اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ اکثر اردو میں بات کیا کرتے تھے میرے متعلق ایک دن فرمایا "یہ خبیث ضرور شاعر بنے گا" اور جب غالباً" پہلی بار کابل ریڈیو کے ایک مشاعرہ میں ان سے ملاقات ہوئی جو اگست 1948ء میں ہوا تھا کیونکہ ان کا ایک لڑکا وہاں ڈائریکٹر تعلیم مقرر ہوا تھا اور بعد میں سابق ریاست سوات میں متعین ہوا تو فرمایا دیکھا میری پیشن گوئی کیسے صحیح ثابت ہوئی دوسری بار پشاور ریڈیو کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی اور وہاں بھی یہی فرمایا۔ مزید کہا کہ حمزہ اب تو ہم تمہیں ریڈیو پر ہی سننا پسند کرتے ہیں۔

ایک شب کو غالباً" نو دس بجے پیٹ میں گڑ بڑ ہونے لگی بستر سے اٹھ کر بیت الخلا گیا چونکہ نیند سے جاگا تھا اس لئے آنکھیں بھاری تھیں بیت الخلا میں بیٹھا تو پھر مجھے کچھ معلوم نہیں کہ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ اب وہاں ہاسٹل اور ہاسٹل کے باہر میری تلاش شروع ہوگئی۔ ویسے بھی سب جانتے تھے کہ میں ہمیشہ سکول سے بھاگ جایا کرتا ہوں مگر رات کی تاریکی میں کہیں بھاگ جانا انہیں کچھ ناممکن سا معلوم ہوا ان کا خیال تھا کہ شاید کوئی اسے پکڑ کر اغواء کر گیا۔ مگر پھر کسی نے مشورہ دیا کہ بیت الخلاء میں ڈھونڈنا چاہئے چنانچہ چند لڑکے جو بھی مجھے یاد نہیں کتنے تھے بیت الخلا میں داخل ہوئے دیکھا تو ایک کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کئی بار کھٹکھٹایا۔ آوازیں دیں مگر میں نے کچھ نہیں سنا بیت الخلاء کے تمام در لکڑی کے تھے جیسے پارٹیشن ہوتے ہیں۔ ایک لڑکا دوسرے بیت الخلاء کا دروازہ کھول کر اوپر چڑھ آیا مجھے اندر دیکھ کر چلایا یہ رہا کسی نے کہا کیا کرتا ہے جواب دیا بیٹھا ہوا ہے اب اوپر سے یہ لڑکا نیچے لٹک کر کود پڑا مجھے خوب ہلایا جلایا مگر میں بدستور سوتا رہا پھر چپلی اتار کر میرے سر پر ضربیں لگائیں تو میں ایک "ہوں" کر کے بیدار ہوا اور پھر اس نے دروازہ کھول کر مجھے پکڑ لیا دوسرے لڑکوں نے اندر آکر خوب مارا اور پکڑ کر بستر تک لے آئے بستر پر پڑتے ہی پھر سو گیا۔

مجھے سکول سے اس قدر نفرت ہوگئی تھی کہ صبح کو سکول کی گھنٹی بجتی تو مجھے صور اسرافیل معلوم ہوتی اب بھی کبھی اسلامیہ کالجیٹ سکول سے گزرتا ہوں تو وحشت سی ہوجاتی ہے بچپن کا نقش کس قدر پائیدار ہوتا ہے اس کا اندازہ اب ہو رہا ہے نتیجہ کے طور علوم متداولہ سے یکسر محروم رہا عالم نہ بن سکا شاید یہ مزاج کا تلون میری فطری شاعری کی استعداد کا نتیجہ تھا اور چونکہ میں بڑی حد تک قانون توارث کا قائل ہوں اس لئے مجھے یقین ہے کہ میرے آباؤ اجداد میں ضرور کوئی شاعر گزرا ہوگا ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خاندان کے تمام افراد شاعر یا شاعری کا ذوق رکھنے والے ہوں گو میرے والد شاعر نہیں تھے مگر ان کے فرمودات آج تک شنواریوں میں ضرب المثل ہیں "ملک باز میر نے یہ کہا تھا" "باز میر خان کا قول ہے" پھر میرے بڑے بھائی ملک نجی خان متوسط درجہ کے شاعر تھے چونکہ صوفی منش تھے اس لئے اکثر نعت لکھا کرتے تھے ان کے بعد یار محمد خان چار بیتہ اور غزل کے مشہور شاعر تھے ان کے بعد ملک باور خان رباب بجانے میں تمام سرحد میں ضرب المثل تھے ایک دفعہ ہارڈنگ تھیٹریکل کمپنی کے لئے پشتو کا ایک گیت فی البدیہہ لکھا۔ گو بعد میں ان کی کوئی غزل وغیرہ نہیں دیکھی۔ خلیل خان کم لکھا کرتے تھے ویسے رباب بجانے میں وہ بھی مشہور تھے۔ مگر بعد میں جب میں خود تو رباب بجانے لگا تو میرا باج باور خان سے بھی بہتر تھا۔ خود مرحوم باور خان نے اس کا اعتراف کیا تھا چنانچہ جب میں 25-1924ء میں بمقام تورخم پاسپورٹ کلرک مقرر ہوا تو ایک دن گرمیوں کے موسم میں ایک چھپر کے نیچے بیٹھا رباب سر کر رہا تھا دوپہر کا وقت تھا اور کابل سے قاسم افغان ریکارڈنگ کے لئے دہلی جا رہا تھا اس کے ساتھ دیگر سازندوں کے علاوہ ایک ربابی بھی تھا قربان علی نام تھا۔ افغانستان بھر میں مشہور تھا وہ میرے سامنے ایک چارپائی پر بیٹھا تھا قاسم صاحب بھی ایک چارپائی پر بیٹھے تھے اور ان کے پاسپورٹ چیک ہو رہے تھے اور چونکہ یہ کام خود نائب تحصیلدار کر رہا تھا اس لئے میں رباب سر کرنے لگا تھا میں نے رباب کے

چھوٹے تار سارنگ راگ کے لئے سر کئے اور جب میں نے ان پر شہباز (مضراب) کی ضرب لگائی اور تاروں سے راگ کا ہیولی ابھرا تو قاسم افغان نے یکایک شوق سے میری طرف دیکھا اور قربان علی نے اچھل کر کہا "ظالم سوختہ کردی" پھر جب میں بجانے لگا تو قربان علی نے کہا "قسم بخدا کہ ایں رنگ باور خان شنواری است" قبائلی لوگوں کی آپس کی دشمنیاں مشہور ہیں چنانچہ میرے والد کئی سال تک قلعہ بند رہے تھے اور وہ ان دنوں صرف رباب سے جی بہلاتے اور وقت گزارتے رہے۔

اب ظاہر ہے کہ جہاں صحیح معنوں میں شاعری ہوگی وہاں موسیقی ضرور ہوگی کیونکہ موسیقی کے امتزاج کے بغیر شاعری کا وجود ناممکن ہے شاعری کے لئے وزن کی جو ضرورت ہے وہ ظاہر ہے اور وزن کے بغیر شاعری ایک جسد بے روح کی مانند ہے آج کل کی آزاد نظموں کی لے اور اوزان ہوا کرتے ہیں اگر وزن سے عاری ہوں تو وہ آزاد ہونے کے باوجود بھی نظمیں نہیں ہوسکتیں۔

میں اردو میں ہمیشہ اول آیا کرتا تھا تاریخ اور انگریزی میں بھی اچھا تھا مگر حساب اور جغرافیے میں سخت کمزور تھا چنانچہ مڈل کے امتحان میں فیل ہوگیا کیونکہ حساب میں فیل ہوا تھا مجھے بہانہ ہاتھ آگیا سکول چھوڑ کر گھر آگیا مگر میرے بڑے بھائی نے شاہ عالم خان مرحوم سے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ کرے انہوں نے میرے پرچے منگوائے دیکھا تو اردو میں تمام کلاس میں اول آیا تھا۔ انگریزی، تاریخ اور جغرافیہ بلکہ تمام مضامین میں کامیاب تھا انہوں نے انسپکٹر سے کہا کہ ایسے طالب علم کو فیل کر دینا قرین مصلحت نہیں چنانچہ مجھے پھر سے کامیاب قرار دیا گیا اور میں نویں جماعت میں آکر بیٹھ گیا۔

مولانا عبدالقادر صاحب شاید ان دنوں تھرڈ ایئر میں پڑھتے تھے گرمیوں کی چھٹیوں میں اکثر میرے ساتھ لنڈی کوتل آتے میرے اردو اشعار کی اصلاح کے ساتھ ساتھ الجبرا بھی سکھایا کرتے تھے لیکن دسویں جماعت میں پھر میں نے سکول

چھوڑ دیا اب چونکہ بڑا ہوگیا تھا اس لئے بھائی اور والد مجھے مارا نہیں کرتے چنانچہ بڑے بھائی صاحب نے جناب عبدالصمد اسسٹنٹ پولیٹکل آفیسر صاحب سے سفارش کر کے مجھے محکمہ پولیٹکل میں بطور کلرک ملازم کرا دیا اور پھر لنڈی کوتل میں ایک تھوڑے عرصہ تک کام کرنے کے بعد تورخم کے مقام پر پاسپورٹ کلرک متعین ہوگیا جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے۔ 1924ء میں میری شادی کرا دی گئی اور 1925ء میں میرا پہلا لڑکا ہوا جو پیدا ہوتے ہی مرگیا اسی سال میں محکمہ پولیٹکل سے استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ رہا۔ 1926ء میں خیبر ریلوے کا کام زور و شور سے جاری تھا میرے والد کو بھی اس میں ٹھیکے دیئے گئے تھے چنانچہ میں والد صاحب کے منشیوں کے ساتھ حساب کتاب میں مدد کیا کرتا تھا مگر اسی سال مجھے ریلوے میں ملازمت دلوا دی گئی میں نے چھ ماہ میں ٹکٹ کلکٹر اور گارڈ کے امتحان پاس کئے پہلے گارڈ کی ڈیوٹی ملی مگر دو چار دن کے بعد ارباب محمد ذکریا خان مرحوم و مغفور نے میرے بھائی باور خان کی سفارش پر ٹی ٹی ای مقرر کرا دیا بعد میں ارباب صاحب مرحوم سے ملاقاتیں رہیں بے حد غریب پرور مہمان نواز اور فقیر دوست انسان تھے ان کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی مجذوب رہا کرتا تھا یکم فروری 1927ء میں میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا کیمپ لنڈی کوتل میں ایک ہندو نجومی رہتا تھا میں نے اس سے مراد علی خان کا زائچہ بنانے کو کہا اس نے تھوڑی دیر تک حساب کرنے کے بعد کہا کہ اپنی متحرک طبیعت کی وجہ سے اچھی زندگی گزارے گا۔

میں اپنی سیمابی فطرت کی وجہ سے کوئی ملازمت دیر تک برداشت نہیں کرسکتا تھا طبیعت آزادی پسند واقع ہوئی تھی محکمہ ریلوے کا تمام ایگریمنٹ ایک استعفیٰ کے ساتھ دفتر روانہ کر دیا اپنے ایک دوست میر عالم خان مرحوم کے ساتھ بمبئی روانہ ہوگیا ہم دونوں کو فلم لائن کا شوق تھا وہاں ایک مہینہ تک رہے مگر کسی فلم کمپنی میں جگہ نہ مل سکی البتہ اپنے پختون بھائیوں کے اخلاق کا خوب تجربہ ہوا۔ یہ لوگ وطن میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں مگر پردیس میں یکے

بھائیوں کی طرح ہمدرد ہوتے ہیں چنانچہ درہ آدم خیل کے ایک پختون احمد گل نے ہمیں اپنے ڈیرے میں بڑے آرام سے رکھا اور ہمیں تمام بمبئی کی سیر کرائی ہم ابھی یہ سوچ رہے تھے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہو گا کہ میرے بھائی لجی خان ہمیں لینے کے لئے بمبئی پہنچے اور ہم مجبوراً ان کے ساتھ واپس روانہ ہوئے ہم احمد آباد کے راستے اجمیر شریف پہنچ گئے بڑے بھائی صاحب کو ویسے بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ غریب نواز سے عقیدت تھی ہمیں بھی اس سعادت سے مشرف کرنا چاہتے تھے بسنت منائی جا رہی تھی اور متولی سید نثار احمد مرحوم قوالوں کو ساتھ لے کر اجمیر شریف کے قریب کے پہاڑوں کی طرف جنگلی پھول چننے نکلے تھے ہم بھی ساتھ تھے اور راستہ میں قوالی گاتے جاتے تھے شہر سے باہر حضرت خواجہ کے چلہ کے پاس پہنچے تو قوالوں نے گانا شروع کیا۔

خواجہ معین الدین کے گھر آج آئی ہے بسنت

یہ سنتا تھا کہ مجھ پر گریہ طاری ہو گیا میر عالم خان بھی رو رہا تھا مگر میری حالت یہ تھی کہ آنسو تھے کہ دریا کی مانند امڈے چلے آ رہے تھے گویا میرے فطری رجحان کی بتی جل اٹھی تھی دنیا کی تمام خواہشات کافور ہو گئیں تھیں اب اجمیر شریف میں جتنے دن رہے ہمیشہ حضرت خواجہ کے دوارے حاضر رہے۔ شام کی نماز اکبری مسجد اور دیگر نمازیں مسجد شاہ جہانی میں پڑھتے۔ 31 جنوری کی شام کو اجمیر شریف سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے یکم فروری 1928ء کو جب چاندنی چوک پہنچے تو اخباری ہاکر چلا رہا تھا "پڑھو، حسن نظامی پر گولی چل گئی" میں نے اخبار لے کر پڑھا تو خواجہ حسن نظامی پر آریہ سماجیوں نے حملہ کیا تھا فائرنگ سے خواجہ صاحب تو بال بال بچ گئے تھے۔ مگر موٹر میں ان کے خسر شہید ہو گئے تھے چونکہ حسن نظامی صاحب مرحوم تبلیغ کیا کرتے تھے اس لئے آریہ سماجی ان کے شدید مخالف تھے میں نے بعد میں خواجہ صاحب کے روزنامچے بھی پڑھے جن میں سے ایک روزنامچے میں تحریر تھا کہ "ایک آریہ سماجی دوست نے عید کی مبارک باد کے طور پر لفافہ میں سور کے

بال بھیج دیئے ہیں میرے دوست کو واضح ہو کہ ہمیں صرف سور کے گوشت کھانے کی ممانعت ہے اس کے بالوں اور ہڈیوں اور چمڑے سے ہمیں کوئی نفرت نہیں۔"

جب سے میں نے سکول چھوڑا تھا شاعری ایک بھولی بسری شے ہو گئی تھی مجھے کبھی لکھنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی شعر لکھ سکتا ہے چنانچہ 1926ء میں جب خیبر ریلوے بن رہی تھی موضع سپیرسنگ سے مزدوروں کی ایک ٹولی ہمارے ہاں کام کرنے آئی تھی ان میں ایک شاعر بھی تھا جو بے علم تھا اور فی البدیہہ کہا کرتا تھا۔ لوگ کسی شے کی طرف بھی اشارہ کر کے کہتے اس پر کچھ کہو تو بے دھڑک کہہ دیتا چنانچہ مزدوروں کے کیمپ اور عام شنواریوں میں اس کی شہرت پھیل گئی ایک دفعہ کچھ لوگ اس کی تعریف کرنے لگے تو میں نے کہا کہ شعر کہنا کیا مشکل ہے لاؤ قلم دوات کہ تمہارے لئے لکھ دوں وہ لوگ واقعی قلم دوات اور کاغذ لے آئے۔ میں نے وہاں اسی وقت بیٹھے بیٹھے پشتو کے دو چار بیتے فی البدیہہ لکھ کر دے دیئے جس سے وہ حیران رہ گئے اس کے بعد پھر میں نے کچھ نہیں لکھا۔

1928ء میں میری دوسری شادی ہو گئی یہ محبت کی شادی تھی اور والد صاحب کی ناراضگی کے باوجود ہو گئی۔ وہ پندرہ برس تک زندہ رہی مگر اولاد سے محروم، میری کتاب "غزونے" (انگڑائیاں) کی اکثر غزلیں اس کی یاد میں کہی گئی ہیں اس نے 1942ء میں وفات پائی مگر جس کی وجہ سے میں دو سال تک گم سم رہا یہ ایک دردناک داستان ہے جس سے صرف نظر کرتا ہوں۔

1935ء میں پشاور سیکرٹریٹ کے اندر آل انڈیا ریڈیو کی شاخ قائم ہوئی جس کے آفیسر انچارج محمد اسلم خان خٹک مقرر ہوئے میں نے سب سے پہلے پشتو ڈراما "زمیندار" لکھا اور پھر ریڈیو پشاور سے نشر ہوا اس وقت عبدالکریم خان پشتو پروگرام کے رواں دواں تھے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

اس کے بعد میں برابر لکھتا رہا اور میں نے سینکڑوں ڈرامے اور مختلف

تقریریں لکھیں میری غزلیں ریڈیو سے نشر ہونے لگیں - 1940ء کے موسم بہار میں بزم ادب پشتو کی طرف سے چوک نمک منڈی کے سلور جوبلی پارک میں ایک بہاریہ مشاعرہ ہوا میں اس بزم کا نائب صدر اور صدر سید راحت زاخیلی مرحوم تھے مشاعرہ طرحی تھا اور پشتو کے مشہور نازک خیال شاعر کاظم خان شیدا کے دیوان سے لیا گیا تھا چنانچہ میں نے اس پر غزل لکھی تھی اور جب نے میں یہ شعر پڑھا

تورے سترگے دے دیار ندہ تہ پہ زیر وی
بیا جشو پہ کعبہ قدلے لام دے

تو سمندر خان سمندر نے بے اختیار ہو کر کہا "واہ بادشاہ غزل" اس کے بعد پھر آہستہ آہستہ یہ لقب مشہور ہو گیا کسی نے بابائے غزل اور کسی نے شہنشاہ تغزل کہا اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے بھی اپنی تمام تر توجہ غزل پر ہی مرکوز رکھی-

میں اپنی زندگی کے واقعات مختصر ہی لکھنا چاہتا ہوں مگر تسلسل قائم نہیں رہتا لکھتے لکھتے درمیان میں کوئی واقعہ یاد آجاتا ہے اور پھر اس کے لکھنے کے بعد تسلسل ذہن سے نکل جاتا ہے-

1930ء میں مجھے اپنے دوست میر عالم خان مرحوم نے پھر فلمی دنیا میں چلے جانے کا مشورہ دیا - لہذا ہم راولپنڈی چلے گئے اور وہاں پنجاب فلم کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر ہری رام سیٹھی سے ملے - اس نے لاہور آنے کی ہدایت کی غرضیکہ اس کمپنی نے ایک خاموش پکچر Falcon میں ہمیں کام دیا مجھے قافلے کا محافظ اور میر عالم خان کو ڈاکوؤں کے رول میں لیا وہاں سے واپس گاؤں آیا تو والد صاحب وفات پاچکے تھے لہذا گھر میں ہی رہنا پڑا میرے شیخ حضرت سید عبدالستار شاہ صاحب چشتی نظامی نیازی فاتحہ کے لئے تشریف لائے ویسے میری ان کی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب کہ میں مڈل کا طالب علم تھا اور پہلی ہی ملاقات میں ان سے بے حد متاثر ہوا تھا - لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس دفعہ وہ میرے لئے ایک ایسا جال لائے ہیں جس سے میں تا عمر نہیں نکل سکتا چنانچہ رات کو میں گھر میں سونے کے

لئے بستر پر پڑا تھا کہ یکایک میری روح قبض ہونے لگی - ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے شروع ہو گئے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آنے لگا میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور دوڑتا ہوا حجرے میں گیا حضور نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا خیر ہو میں نے کہا کہ حضور میں مر رہا ہوں مسکرا کر فرمایا "موتو قبل ان تموتو" پھر پانی دم کر کے پلایا سکون حاصل ہوا اور بعد میں یہ دورہ کبھی کبھی پڑتا رہا انہوں نے میرا علاج رجا کے بجائے خوف پر مناسب سمجھا تھا کیونکہ بے حد باغی طبیعت کا انسان ہوں گو میں نے فلسفے کی کوئی کتاب نہیں پڑھی لیکن فطری طور پر پورا فلسفی تھا آخر میں نے 1931ء میں ان کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کر لی-

مختصر طور پر میں اس قدر عرض کروں کہ برابر بیس برس تک خوف کا شکار رہا میں نے اس قسم کے واقعات اپنی کتاب "تذکرہ ستاریہ" میں لکھ دیئے ہیں جس کا ترجمہ پشتو سے اردو میں جناب سید طاہر بخاری نے کیا ہے اور یہ کتاب چھپ چکی ہے-

1937ء میں، میں نے پشتو میں پہلی کتاب لکھی - "تجلیات محمدیہ" کتاب تصوف کے متعلق تھی یہ آج کل خال خال ملتی ہے - 1938ء میں مجھ پر الحاد کا دورہ آیا جو پانچ برس تک رہا مگر اس عرصہ میں ہمیشہ اپنے شیخ کے پاس ہی رہا- میرے ذہن نے ذات باری کی نفی میں عجیب و غریب دلائل تراش لئے تھے کبھی کبھی حضرت شیخ سے جھڑپ ہو جاتی مگر میں جلد خاموش ہو جاتا-

1941ء کے دسمبر میں بمبئی گیا رفیق غزنوی مرحوم کی پیشکش پر پہلی پشتو فلم لیلیٰ مجنوں کے گانے اور مکالمے لکھے وہاں دو ماہ عجیب و غریب حالت میں گزارے الحاد کی منزل ختم ہو چکی تھی اور وہ یوں کہ ایک دن میں اجمیر شریف میں رجب کی نویں تاریخ کو دربار شریف کے غسل کے بعد سو رہا تھا اور میرے ایک پیر بھائی غلام سرور علوی جاگ رہے تھے جسے میں مولانا کہا کرتا تھا اور وہ مجھے امیر حمزہ شاہ کہا کرتے تھے عالم خواب میں کسی نے مجھے پکارا "دہلی چلو" میں یکایک جاگ

کر اٹھ بیٹھا - مولانا غلام سرور نے کہا کہ امیر حمزہ شاہ آپ نے یہ آواز سنی میں نے حیران ہو کر کہا "مولانا میں نے تو یہ آواز خواب میں سنی ہے آپ کو کیسے معلوم ہوا" فرمایا "وہ آواز مجھ سے گزرتی ہوئی آپ کی طرف گئی ہے - دہلی چلنا چاہئے -" چونکہ عرس ختم ہو چکا تھا اس لئے ہم نے حضور بادشاہ جان سے اجازت لی اور شام کی گاڑی سے دہلی روانہ ہو گئے اور صبح دہلی پہنچ گئے ایک ہوٹل میں اپنا مختصر سامان رکھنے کے بعد ہم نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمت اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور واپسی پر حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے مزار پر حاضری دی ' فاتحہ سے فارغ ہو کر مولانا غلام سرور نے کہا "بھائی آپ نے خواجہ حسن نظامی کی شہرت سنی ہے" میں نے اثبات میں سر جھکا دیا - فرمایا ان کی زیارت کرنی چاہئے چنانچہ ہم پوچھتے پوچھتے حضرت خواجہ حسن نظامی کی نشست گاہ تک پہنچے خواجہ صاحب ایک دیوار سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے بس ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے پہلے مولانا غلام سرور نے مصافحہ کیا پھر میں نے بڑھ کر مصافحہ کیا - خواجہ صاحب نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر فرمایا "کہاں سے آئے ہو" میں نے کہا کہ "پشاور سے"- فرمایا "رہنے والے کہاں کے ہو -" عرض کیا "لنڈی کوتل کا" فرمایا "پھر تو ملک باور خان شنواری کو جانتے ہو گے" عرض کیا "حضور وہ میرے بھائی ہیں" متعجب ہو کر فرمایا "اچھا ہم تو تمہارے ہاں آئے ہیں تم اس وقت کہاں تھے" عرض کیا "پنجاب گیا تھا -" فرمایا "ہاں تیری کھیتی میں ہل تو بہت چلا ہے لیکن دانہ نہیں پڑا ہے یہاں تمہاری ایک امانت ہے وہ لیتے جاؤ اور پھر انہوں نے اپنے بڑے لڑکے حسین نظامی کو آواز دے کر فرمایا "حسین ' بیٹا وہ قلمی کتابچہ تو لے آؤ" حسین نظامی وظائف کا ایک قلمی کتابچہ لے آئے خواجہ صاحب نے اس پر کچھ لکھ کر میرے حوالے کیا تحریر فرمایا تھا "امیر حمزہ شنواری نظامی کو ان تمام اوراد و اشغال کی اجازت دی جاتی ہے اور اسے بیعت لینے کی بھی اجازت دی جاتی ہے -"

میں 1931ء سے 1946ء تک ہر سال عرس کے موقع پر اجمیر شریف جایا کرتا تھا لیکن تصوف کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد عجیب و غریب حالات سے سابقہ

پڑا جس کا مختصر سا حال میری کتاب "تذکرہ ستاریہ" میں موجود ہے ایک عجیب قسم کے جذبے سے سابقہ پڑا جو نہ تو جنوں و مستی ہے نہ ہوش - 1935ء میں اپنا رباب ساتھ لے کر غیر ارادی طور پر لاہور چلا گیا وہاں ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع ایک پہلوان نما دکاندار کی دکان میں اقامت اختیار کی جسے لوگ ممسٹر کہا کرتے تھے وہاں ایک نوجوان سے شناسائی ہو گئی اس کا نام محمد اکبر تھا جہلم کا رہنے والا اور غالباً" فرسٹ ایریا سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا یتیم تھا اس کے بیان کے مطابق اس کا باپ سب انسپکٹر تھا اور بنگال میں کہیں ڈیوٹی پر لگا ہوا تھا سوتیلی والدہ کے ظلم و ستم سے لاہور فرار ہو کر آ گیا تھا صاحب عزم اور ہوشیار نوجوان تھا دیہاتوں میں نکل کر انڈے خریدتا اور شہر لا کر فروخت کرتا اور اس طریقہ سے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا چنانچہ ایک دن جبکہ وہ دیہات میں انڈے خریدنے جا رہا تھا مجھ سے کچھ رقم کا مطالبہ کیا میں نے حسب منشاء رقم دے دی اور خود بھی اس کے ساتھ نکل چلا کیونکہ میں اضطراب مسلسل کی وجہ سے ایک جگہ نہیں ٹک سکتا تھا وہ میری طبیعت سے بڑا خوش ہوا چنانچہ ہم راوی روڈ پر چل پڑے اور چلتے چلتے شام سے کچھ قبل ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب پہنچے وہاں ایک دہقان ہل چلا رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہل کی مٹھی اور دوسرے میں حقہ تھا جو چلتے چلتے گڑگڑاتا جاتا تھا میں نے اس سے کہا "او بھائی کیا تم روزے نہیں رکھتے" جواب: "جاؤ بھائی ہم عیسائی ہیں" بعد میں محمد اکبر نے بتایا کہ یہاں عیسائی مشنریوں نے بہت لوگوں کو عیسائی بنا دیا ہے لیکن ہمارے ملا صاحبان حلوے مانڈے سے کام رکھتے ہیں خیر ہم گاؤں کی مسجد میں فروکش ہو گئے وہاں ایک بڑا سا نقارہ رکھا گیا تھا افطاری کے وقت اس پر چوٹ پڑی اور اس کے ساتھ ہی امام مسجد اندر آ داخل ہوا اس کا حلیہ دیکھ کر گھن آنے لگی -

واضح ہو کہ اس زمانے میں میری حالت ایسی تھی کہ کسی اجنبی کی صورت دیکھتے ہیں اس کے اخلاق کا اندازہ کر لیا کرتا تھا اور نوے فیصد صحیح ہوتا تھا نماز جماعت سے پڑھی گئی گو محمد اکبر لاہور میں نماز نہیں پڑھتا تھا مگر دیہات میں آنے

کے بعد پڑھ لیتا تھا نماز کے بعد محمد اکبر نے کہا تھا بھوک لگ رہی ہے - اب کیا کیا جائے - میں نے کہا کہ تمہارے لئے چاول پہنچ جائیں گے ویسے بھی بنگال میں رہنے کی وجہ سے چاول پسند کرتے ہو اور میں تو چاول کھاتا ہی نہیں - تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک آدمی چاول کی بھری ہوئی تھالی لے آیا - محمد اکبر نے میری طرف دیکھا گویا میری پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی وہ چاول پر پل پڑا میں نے صرف دو چار لقمے لئے وہاں پیش امام کو میاں جی کہہ کر پکارتے تھے تراویح تو میں ویسے بھی نہیں پڑھتا - عشاء کی نماز بھی میں نے علیحدہ پڑھی جس پر میاں جی کچھ برافروختہ ہوگئے چھوٹے بچے پڑھنے کے لئے آئے تھے ان میں ایک بوڑھا بھی میاں جی سے قرآن حکیم سیکھتا تھا - میاں جی نے کہا کہ "خان صاحب آپ نے نماز باجماعت کیوں نہیں پڑھی "- "اس لئے کہ آپ کی قرات صحیح نہیں" میں نے جواب دیا - میں چونکہ بطعا" اسے پسند نہیں کرتا تھا اس لئے پیچھا چھڑانے کے خیال سے اور کچھ محمد اکبر کے اشاروں سے جو کہہ رہا تھا کہ خدا کے لئے پردیس میں جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش نہ کرنا میں نے جواب دیا "آپ صرف بسم اللہ ہی کہیں" اس نے جیسا کہ عام طور پر پنجابیوں کا لہجہ ہے کلمہ پڑھا میں نے کہا کہ یہ اصل میں باسم ہے بسم نہیں اس کے اندر جو الف ہے مدغم ہے - اسے کیسے پڑھو گے - میاں جی نے قرآن حکیم رکھ دیا اور خاموشی سے باہر چلے گئے وہ بوڑھا میرے نزدیک کھسک کر کہنے لگا "خان مجھ سے بھی سنو" اس نے بھی قرآن ایک طرف رکھ دیا اور باہر چلا گیا ایک لڑکا میرے قریب آکر کہنے لگا ' "خان یہ ہمارے میاں صاحب بڑے خراب آدمی ہیں" میں نے کہا کیسے - اس نے کہا کہ خان دیکھو تو یہ بوڑھا میرا باپ ہے اور میرے باپ نے میری ماں کی زندگی ہی میں میری خالہ سے بھی نکاح پڑھوا لیا ہے - میں نے گرج کر کہا کہ نکاح کس نے پڑھایا ہے اس نے کہا کہ میاں جی نے - میں نے کہا بیٹا جاؤ اور میاں جی کو یہاں بھیج دو لڑکا اندر گیا دوسرے تمام لڑکے بھی چلے گئے لیکن میاں جی باہر نہیں آئے حتیٰ کہ سحری کا وقت ہوگیا چنانچہ میاں جی دو بڑے پراٹھے ساتھ میں دو قسم کی ترکاری لے کر آئے اور اسلام و علیکم کے بعد کہنے لگے - "خان

صاحب معافی چاہتا ہوں ہم یہاں دیہات میں گزارہ کرتے ہیں - آپ لاہور میں یہاں کے حالات لوگوں سے بیان نہ کریں -" میں نے کہا کہ مجھے کیا پڑی ہے کہ لوگوں سے یہاں کے حالات بیان کرتا پھروں اور اس کے ساتھ ہی چراغ بجھ گیا میاں صاحب دیا سلائی لینے گئے اور میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک پراٹھا اپنے رومال میں لپیٹ کر کوٹ کی جیب میں رکھ دیا اور جب میاں صاحب نے چراغ روشن کیا تو دیکھا کہ ایک پراٹھا غائب ہے ساتھ ہی سادہ روٹیاں بھی تھیں ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھایا صبح کی نماز سے فارغ ہو کر ہم آگے روانہ ہوگئے جگہ جگہ دیہات میں محمد اکبر انڈے خریدتا گیا ایک جگہ پیاس لگی - محمد اکبر نے ایک دیہاتی عورت سے پانی مانگا اس نیک بخت نے ہمیں لسی پلائی اس کا شکریہ ادا کرکے آگے بڑھے - خانہ بدوشوں کے ایک کیمپ سے گزر ہوا - محمد اکبر نے صدا لگائی " انڈے بیچو انڈے" چھوٹے بڑے ہمارے گرد اکٹھے ہوگئے ان میں ایک نو بیاہتا دلہن بھی تھی اس نے محمد اکبر کی عینک اتار کر دیکھا الٹ پلٹ کرنے کے بعد کہا کہ کتنے میں آئی ہے - محمد اکبر نے کہا کہ آٹھ روپے میں - دلہن نے ہونٹ سکیڑ کر کہا واہ یہ اور آٹھ روپے اور عینک کو زمین پر دے مارا لیکن اتفاق سے عینک نہیں ٹوٹی -

ہم تمام دن چلتے رہے - جگہ جگہ انڈے خریدے ' آخر شام سے کچھ قبل ایک قصبہ جوئیاں والا پہنچے ' محمد اکبر نے انڈے بیچو کی صدا بلند کی ' جواب میں چند کتے غراتے ہوئے حملہ آور ہوئے مگر قصبے کے چند آدمیوں نے کتوں کو بھگا دیا اور ہم قصبے کی ایک بڑی مسجد میں جا داخل ہوئے چنانچہ نقارہ بجا دیا گیا لوگوں نے روزے افطار کئے اور پھر ایک امام صاحب نے نماز پڑھانا شروع کی دوسری رکعت ہی میں سلام پھیر دیا کسی نے کہا کہ میاں جی نماز دو رکعت پڑھی گئی - فرمایا "اب بقیہ ایک رکعت پڑھی جائے گی" مسجد میں ایک پیر صاحب بمع مریدوں کے موجود تھے کہنے لگے یہ نماز نہیں ہوئی - پھر سرے سے پڑھاؤ - میاں جی نے ایک کتاب اٹھا

کر دکھائی اور کہا "یہ صحیح بخاری شریف ہے۔ پیر صاحب یہ دیکھئے حدیث شریف
ایک بار ایسے ہی آنحضرت صلعم نے شام کی نماز دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا تھا
کسی نے عرض کیا تھا کہ حضور اللہ تعالیٰ نے نماز میں تخفیف کر دی ہے یا آپ کو سہو
ہو گیا ہے آنحضرت صلعم نے جواب دیا مجھے سہو ہو گیا ہے لہٰذا اٹھو اور ایک رکعت
پڑھو چنانچہ آنحضرت صلعم نے بقیہ ایک رکعت پڑھائی پیر صاحب نے کہا کہ ہم یہ
نہیں مانتے بھائیو جو ایمان عزیز ہے پھر ابتداء سے نماز پڑھو اب مجھ میں تاب نہ
رہی اٹھ کر کہا "تم پیر ہو یا پیر! میاں جی نے حدیث رسول دکھائی اور تم کہتے ہو ہم
نہیں مانتے یا تو تم بھی کوئی ایسی حدیث بیان کرو جو اس کے خلاف اور زیادہ صحیح ہو
یا چلتے پھرتے نظر آؤ اور پھر میں نے مقتدیوں سے کہا کہ بھائیو میاں صاحب کا
موقف صحیح ہے آؤ ایک ہی رکعت پڑھتے ہیں پیر صاحب تو مع مریدوں کے باہر چلے
گئے اور ہم نے بقیہ ایک رکعت پڑھی اور جب مقتدی جا چکے تو میاں صاحب نے
کہا کہ خان صاحب آپ میرے مہمان ہیں اور پھر کھانا لینے چلے گئے محمد اکبر جو کسی
حد تک بدمزہ ہو رہا تھا کہنے لگا یار آپ ہر جگہ فساد کھڑا کرتے ہیں میں نے کہا اسی
فساد کی تو برکت ہے کہ اب تمہیں اچھا کھانا ملے گا میاں صاحب کھانا لے کر آ گئے
اچھا کھانا تھا گھروں سے بھی مختلف کھانے آ گئے پھر تراویح و نماز عشاء کے بعد دیر
تک میاں صاحب سے تبادلہ خیال ہوتا رہا مجھے حقہ پینے کی لت تھی جو میں نے
میاں صاحب کو بتائی تھی اس نے ایک لڑکا ساتھ کر دیا اور مجھے ایک شخص کے گھر
لے گیا۔ حقہ گڑا کو بھرا تھا وہ آہستہ آہستہ گڑگڑا رہا تھا میں نے ایک ایسا کش لیا کہ
چلم پر شعلہ بھڑک اٹھا گھر والوں نے شور مچایا ارے ختم کر دیا اور میں نے وہاں
سے فوراً" اٹھ کر مسجد آ گیا۔

سحری کے وقت بھی میاں صاحب نے اچھا کھانا کھلایا اور جب صبح کی نماز
ہو چکی تو میرا اضطراب بھڑک اٹھا میں نے میاں صاحب سے کہا کہ یہاں کوئی
نزدیک ریلوے اسٹیشن ہے۔ جواب دیا ہاں یہاں سے کوئی سات میل کے فاصلہ پر

چھچو کی ملیاں ایک سٹیشن ہے۔ لاہور جانے کے لئے گیارہ بجے ایک گاڑی آتی ہے
میں نے محمد اکبر سے کہا کہ میں جا رہا ہوں اس نے کہا کہ بھائی کیا کرتے ہو ساتھ ہی
چلیں گے میں نے کہا کہ نہیں بس اب لاہور میں ملاقات ہو گی اور وہاں سے چل
پڑا۔ راستے میں ایک جگہ چند کوچی افغان کام کرتے ملے انہوں نے روکنا چاہا مگر
میں چلتا ہی گیا ایک جگہ خانہ بدوشوں کے کیمپ سے گزرا تو ایک عورت خیمہ کے
اندر نظر آئی اوپر سے عریاں اور نیچے کا دھڑ گھاس سے چھپا ہوا۔ دل کو ایک دھچکا
سا لگا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور انسان ہیں اور جو بنگلوں اور محلوں میں رہتے
ہیں وہ بھی انسان ہیں لیکن میں چلتا رہا اور جب چھچو کی ملیاں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی
بھی آ گئی۔ مجھے لاہور کے لئے پانچ آنے میں ایک تھرڈ کلاس ٹکٹ دے دیا گیا اور
میں ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا گاڑی چلتی رہی اور میں اپنی سوچوں میں گم رہا ایک
اسٹیشن پر گاڑی رک گئی تو یکایک مجھے اپنے شیخ حضرت سید عبدالستار شاہ صاحب کا
نام سنائی دیا پلیٹ فارم سے آواز آئی تھی میں نے چونک کر کھڑکی سے سر باہر نکالا تو
سامنے سٹیشن کا نام قلعہ ستار شاہ لکھا ہوا تھا بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے
اور آتش اضطراب پر گرنے لگے ایک خوشگوار سکون حاصل ہوا لاہور پہنچا تو محمد
اکبر نہیں آیا تھا میں عصر کے وقت دکان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا کہ ایک مجذوب
آیا وہ ادھر ادھر سے کوڑا کرکٹ لا کر جمع کرنے لگا اور جب ایک بڑا سا ڈھیر بن گیا
تو میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا "لگا دوں آگ" میں نے کہا کہ لگا دو۔ مجذوب
نے دیا سلائی دکھائی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں آگ بھڑک اٹھی ابھی آگ
ٹھنڈی نہ ہونے پائی تھی کہ شہر میں فوج آرمرڈ کار اور پولیس کی لاریاں داخل
ہو گئیں ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا میں نے لاہوری نوجوانوں کو دیکھا کئی ایک تلواریں
لٹکائے جائے فساد کی طرف بھاگ رہے تھے اس دکان کا مالک ممن پہلوان بھی چلے
گئے تھے اور میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا کہ یک بیک کیا ہو گیا ایک گھنٹے کے بعد پہلوان
اور ساتھی واپس آ گئے پہلوان نے کہا کہ واہ خان صاحب، ہم نے تو ہندوؤں سے

لڑائی کی اور تم یہاں بیٹھے رہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھا روانہ ہو گیا چونکہ
لاہور شہر میں اجنبی تھا اس لئے جس طرف منہ اٹھا چل پڑا چنانچہ میں سیدھا
گوالمنڈی پہنچا جو ہندو اکثریت کا حصہ تھا وہاں بکثرت ہندو کھڑے تھے کسی کے پاس
تلوار، کسی نے لاٹھی لے رکھی ہے تو کوئی خنجر سے مسلح ہے ایک دکان مسلمان کی
تھی جو دودھ فروخت کرتا تھا اس نے دکان کے تختے گرا دیئے تھے اور سوراخوں
سے بازار کی طرف دیکھ رہا تھا مجھے دیکھنے پر پکار اٹھا خان صاحب بھاگو ہندو مار
ڈالیں گے اب مجھے ہوش آیا مگر الٹے پیروں بھاگنا غیرت کے خلاف تھا سورۃ مزمل
پڑھتا ہوا سیدھا چلنے لگا ہندو مجھے تیز و تند نظروں سے گھور رہے تھے۔ آپس میں
سرگرمیاں سرگوشیاں بھی کرتے رہے مگر میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ بازار کی یہ گلی
ختم ہوئی اب مجھے دوسری طرف نکلنا تھا کہ ایک گورے سپاہی نے میرے سینے پر
سنگین رکھ کر کہا "Who are you" میرے ہاتھ اضطراری طور پر اپنی واسکٹ کی
جیب کی طرف بڑھے میری جیب میں کیمپ لنڈی کوتل میں داخل ہونے کا پاس تھا جو
ٹھیکہ داروں کے لئے جاری کیا جاتا تھا میں نے وہ پاس نکال کر سپاہی کو دیا اس نے
پاس دیکھ کر سر سے پیر تک مجھے دیکھا اور مسکرا کر کہا well go on اور جب میں
دوسرے بازار میں نکل آیا تو تمام بازار اینٹوں ڈنڈوں چاقوؤں اور مختلف چیزیں
سے بھرا ہوا تھا ہوٹل واپس آیا تو میں نے پہلوان سے کہا کہ یار تم تو نے مجھے مروا
ہی دیا تھا مگر خدا نے بچا لیا۔ اس نے کہا کہ کیوں۔ میں نے کہا کہ میں گوالمنڈی گیا
تھا۔ پہلوان نے متعجب ہو کر کہا پھر زندہ کیسے لوٹے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا کرم
ہے شام کے بعد محمد اکبر بھی واپس آ گیا۔

اس دوران پنجاب فلم کمپنی کے سٹوڈیو میں بھی جاتا اور ہری رام سیٹھی
اور دیگر اداکاروں سے گپ شپ لڑاتا رہا۔ میری عجیب حالت تھی جسے نہ تو محض
جذب سے منسوب کر سکتا ہوں اور نہ سحر سے پنجاب فلم کمپنی کے خلاف ایک
مقدمہ شروع تھا اور برابر پیشیاں ہو رہی تھیں کمپنی کے دو چوکیدار تھے ایک ہندو

دوسرا مسلمان سید، وہ ہندو چوکیدار دست شناس تھا لوگ اسے ہاتھ دکھایا کرتے
تھے میں نے بھی ایک دن اسے اپنا ہاتھ دکھایا اس نے میرا ہاتھ دیکھا اور حیرت
سے منہ دیکھنے لگا میں نے کہا خیر باشد۔ کہا خان صاحب یا تو تمہیں بہت بڑا دولت
مند ہونا چاہئے یا بہت بڑا ولی۔ میں نے کہا کہ میں ان میں سے ایک بھی نہیں ہوں۔
کہا "پرمیشور کی سوگند میں آپ کی بات نہیں مانوں گا۔ سو اگر آپ دولت مند نہیں
جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے تو آپ بڑے اور مہان ہیں لہٰذا میرے لئے دعا کریں۔
میں نے ہنس کر کہا۔ دعا سے کیا ہو گا۔ اپنے کرموں کا پھل ملے گا وہ اور بھی متعجب
ہوا میں نے کہا میں نے ویدک دھرم کا بھی مطالعہ کیا ہے میں نے کہا تعجب اور حیرت
کی ضرورت نہیں اس نے کہا کہ کل گھوڑا دوڑ ہے اور مجھے روپوں کی ضرورت
ہے کیونکہ میرا بچہ ہونے والا ہے اس لئے آپ توجہ کریں کہ جس گھوڑے پر میں
شرط لگاؤں وہ جیت جائے میں نے بے خیالی سے کہا جیت جائے گا وہ خوشی سے
ناچنے لگا سید چوکیدار نے کہا کہ میرے لئے بھی دعا کریں میں نے کہا کہ سید کے لئے
قمار بازی اچھی نہیں۔

اتفاق دیکھئے کہ ہندو چوکیدار کو ریس میں کافی روپے ملے اور سید چوکیدار
ہار گیا اس کے بعد ہندو چوکیدار نے مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا میں نے اسے
مشورہ دیا کہ ہنگامی جذبات کی وجہ سے اپنا آبائی عقیدہ تبدیل کرنا باعث ندامت
ہوا کرتا ہے اس لئے جلدی مت کرو، دیکھو اور انتظار کرو، اسلام کی سچائی پرکھنے
کی کوشش کرو، جب اطمینان ہو جائے تو مسلمان ہو جاؤ۔

دوسرے دن محمد اکبر میرے روپے لے آیا جو میں نے انڈوں کے لئے
دیئے تھے میں اس وقت اپنا روزنامچہ لکھ رہا تھا جوئیاں والا کے سفر کا روزنامچہ میں
نے اسے سنایا تو اسے حیرت ہوئی۔ کہنے لگا آپ اس قدر شستہ اردو کیسے لکھ سکتے
ہیں ظاہر ہے کہ اس زمانے میں میری اردو تحریر نظم و نثر ہر لحاظ سے اچھی تھی اور
اردو بولتے وقت اہل زبان معلوم ہوتا ہے مگر جب 1933ء میں مرشد کے حکم پر

پشتو میں لکھنا شروع کیا تب بھی اردو لکھنے بولنے میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا مگر اب 1975ء میں جو کچھ ہے وہ آپ کے سامنے ہے میں اسے بھی غنیمت سمجھتا ہوں افسوس ہے کہ لاہور میں ایک مہینہ رہتے ہوئے روزنامچہ لکھا تھا وہ ضائع ہو گیا ہے ورنہ میں نمونہ کے طور پر کچھ یہاں درج کر دیتا۔

میں ہفتہ وار اخبارات میں اکثر پارس اخبار کا مطالعہ کیا کرتا تھا کیونکہ اس کے ایڈیٹر کرم چند اور نائب مدیر سیوک رام باقر میرا بڑا احترام کرتے تھے میرے افسانے بھی شائع کرتے تھے چنانچہ اس روز میں اخبار "پارس" لینے کے لئے ریلوے اسٹیشن کے بک سٹال پر گیا چونی نکال کر اسے دی اس اخبار کا ایک پرچہ اس وقت دو آنے میں ملتا تھا اس نے ایک چوکور دونی واپس دے دی اور میں پڑھ اوڑھے ہوئے واپس روانہ ہو گیا دونی ابھی تک ہاتھ میں تھی۔ پہلوان کی دکان کے قریب ایک مجذوب عورت بیٹھی ہوئی تھی اس کے ارد گرد چند مجذوب اور دیگر آدمی بھی بیٹھے تھے مجذوب عورت کا سر ہل رہا تھا اور کیف و مستی میں جھوم رہی تھی مجھے آتے دیکھا تو آواز دی "اوئے منڈیا دہ دونی دے جا" میں نے دونی دے دی تو غور سے میری طرف دیکھ کر کہا چل پشاور۔ یہ سننا تھا کہ میرا تمام اضطراب کافور ہو گیا اور پشاور جانے کی خواہش نے طوفانی شکل اختیار کی میں نے ہوٹل پہنچتے ہی جانے کی تیاری کی پہلوان اور محمد اکبر دونوں متعجب تھے اور ٹھہرنے کے لئے اصرار کر رہے تھے مگر یہاں تو ایسا جن سوار ہو گیا تھا کہ الفاظ میں اس کا بیان مشکل ہے چنانچہ اسی روز لاہور سے روانہ ہو گیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں 25 نومبر 1935ء کو پشاور سے روانہ ہوا تھا اور 25 اکتوبر 1935ء کو لاہور سے واپسی ہوئی شام کو راولپنڈی پہنچا اور سیدھا ارباب محمد ذکریا مرحوم کے مکان پر پہنچا جو ریلوے کے بہت بڑے افسر تھے اور مجھے ٹی ٹی ای لگایا تھا ان کے ہاں اکثر مجذوب آیا کرتے تھے میں نے سوچا چلئے آج ان کے ڈیرے پر ایک اور مجذوب کا اضافہ سہی ارباب صاحب نے خوب آؤ بھگت کی وہ رات اور اگلا دن وہاں گزرا اور دوسرے دن

رات کے دس بجے والی پسنجر ٹرین سے پشاور آیا۔

جیسے کہ عرض کر چکا ہوں، میری فطرت میں بغاوت کا مادہ ذرا زیادہ ہے اس لئے میرے شیخ نے میری اصلاح کے لئے خوف تجویز کیا تھا اور 1933ء میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں چوبیس گھنٹے عالم نزع میں رہا کرتا تھا ایک مہینہ اجمیر شریف میں رہا صبح ہوتے ہی باہر جنگل میں نکل جاتا ایک شنواری نوجوان ملنگ نور محمد مجھے وہاں کھانا پہنچا جاتا اور عشاء کے بعد خانقاہ میں آ کر ایک جگہ پڑ جاتا تھا اور چونکہ یہ تمام حالات میری کتاب تذکرہ ستاریہ میں مختصر طور پر موجود ہیں اس لئے اس کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتا اور ویسے بھی میں اپنی سوانح کو مختصر کرنا چاہتا ہوں۔

1938ء میں ایک ریکارڈنگ کمپنی سے گیتوں اور ڈراموں کا ایگریمنٹ ہونے کی وجہ سے دہلی روانہ ہوا جہاں ایک ہوٹل میں جناب علامہ مشرقی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی جس کا ذکر ہو چکا ہے اس ریکارڈنگ میں مردان کی دو بہنیں صبر النساء و مہر النساء بھی ساتھ تھیں چنانچہ ایک دن ان دونوں بہنوں کے ہاں بہزاد لکھنوی بھی تشریف لائے اور اپنے چند گیت دیتے ہوئے فرمایا کہ "ریڈیو والوں سے کہنا کہ میں بہزاد صاحب کے گیت گانا پسند کرتی ہوں" واضح ہو کہ بڑی بہن یعنی صبر النساء اردو گیت خوب گایا کرتی تھی اس کے مقابلے میں چھوٹی بہن مہر النساء کی آواز تو زیادہ اچھی نہ تھی البتہ پشتو ڈراموں کی بہترین آرٹسٹ تھی اب نہ بہزاد لکھنوی اس دنیا میں موجود ہیں اور نہ صبر النساء و مہر النساء۔ چنانچہ اس ضمن میں اس واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہو گا جو ریڈیو سے تعلق رکھتا ہے اور وہ یہ کہ ریڈیو والے مجھے ڈراما لکھنے کے لئے ایسے عنوان دیا کرتے تھے جن پر ڈراما لکھنا بڑا مشکل ہوتا تھا میں ڈرامے خصوصاً" ریڈیائی ڈرامے فی البدیہہ لکھا کرتا تھا اس وقت ڈرامے کی فیس زیادہ سے زیادہ دس روپے دی جاتی تھی مگر ایک دن انہوں نے مجھے ایک کنٹریکٹ دیا صرف چھ روپے میں آدھ گھنٹے کا منظوم ڈراما اور اس کا عنوان تھا "میراثیوں کا شہر" پشتو میں "ڈوماتو بنار" پہلے تو میں نے لکھنے سے انکار

کردیا مگر بعد میں اپنی شکست کا خیال کرکے لکھنا منظور کرلیا پلاٹ یہ تھا کہ ایک مسافر رات کے وقت ایک شہر کے دروازے پر پہنچتا ہے جب چوکیدار دروازہ کھولتا ہے اور مسافر اندر داخل ہوتا ہے تو چوکیدار اسے ایک چپت رسید کرکے کہتا ہے کہ تمہارے قدم بے تال پڑ رہے ہیں مسافر کہتا ہے کہ تو کیا تم مجھے میراثی سمجھتے ہو۔ چوکیدار جواب دیتا ہے کہ یہاں آکر میراثی بننا پڑے گا کیونکہ یہ میراثیوں کا شہر ہے پھر اسے کوتوال کے پاس لے جایا جاتا ہے وہ اسے شہر کے موسیقی کے استاد کارغہ استاد (یعنی کووں کا استاد) کے پاس لے جاتے ہیں وہ اسے سارے گاما پادھانی سکھانے لگتا ہے اور ساتھ ہی مارتا بھی جاتا ہے استاد کارغہ کی لڑکی آلوچے سے مسافر کی آنکھ لڑ جاتی ہے اور پھر دونوں میں محبت ہوجاتی ہے ایک دن آلوچہ مسافر سے پوچھتی ہے کہ راگ کی تعلیم کہاں تک حاصل کی وہ جواب دیتا ہے کہ تمہاری محبت میں سب کچھ فراموش ہوچکا ہے صرف ایک دادرے کی تال یاد ہے آلوچہ کہتی ہے بتاؤ اب اس کے ساتھ طبلہ پر دادرے کی تال بجاتا ہے مسافر کہتا ہے۔

وا زنہ ستا پینہ = دھا دھنا تا تنا
ما وژنی ستا مینہ = دھا دھنا تا تنا
(اے تیرا مرمریں زنخداں۔ دھا دھنا تا تنا
مجھے تیری محبت قتل کرتی ہے دھا دھن تا تنام)

اور آخر کار وہ ایک گھوڑے پر آلوچہ کو سوار کرکے بھگا لے جاتا ہے استاد کارغہ شور مچاتا ہے ارے او میراثیو دوڑو وہ میری لڑکی بھگائے لئے جارہا ہے لینا جانے نہ پائے۔ میراثی کہتے ہیں استاد کیسے روکیں کارغہ کہتا ہے اپنے تمام ساز بے ہنگم طور پر بجاؤ تاکہ گھوڑا گھبرا کر دونوں کو گرادے چنانچہ ڈھول، طبلے، باجے، سارنگیاں، بانسریاں، رباب اور تمام سازوں کا ایک بے ترتیب طوفان اٹھ کھڑا

ہوتا ہے مگر مسافر دادرے کی تال الاپتا ہوا صاف نکل جاتا ہے۔

جب میراثیوں کو اس ڈرامے کی اطلاع ہوئی تو سب نے احتجاجا" کام کرنا بند کردیا جس پر ریڈیو والوں نے ڈراما براڈ کاسٹ نہیں کیا اور 1933ء میں ریکارڈنگ کے موقع پر میں نے جب اس کا خلاصہ چھ منٹ کا لکھ کر وہ ریکارڈ کرنا چاہا تو صبر النساء اور مہر النساء کا بھتیجا دلبر راج احتجاج کرنے لگا وہ بہترین ہارمونیم نواز اور گویا تھا بچارا دق کا مریض ہو کر مرا۔ آخر ریکارڈنگ ایجنٹ نے بڑی خوشامد کے بعد اسے اس بات پر راضی کرلیا کہ ڈرامے کا نام بجائے "ڈمانو خار" یعنی میراثیوں کا شہر کے "د شوقیانو خار" یعنی اہل ذوق کا شہر رکھا جائے چنانچہ وہ ڈراما شوقیانو خار کے نام سے ریکارڈ ہوا۔ میں نے ریڈیو کے لئے دو تین سو سے زیادہ ڈرامے اور فیچر وغیرہ لکھے ہوں گے مگر ایک کی نقل بھی نہیں رکھی "ڈمانو خار" مسودہ چونکہ ریڈیو والوں نے واپس دے دیا تھا اس لئے وہ میرے پاس موجود ہے مگر اب جو تلاش کرتا ہوں تو نہیں ملتا اس میں مسافر کا پارٹ میرے ایک شاگرد گل زمان نے کیا تھا۔

1939ء میں میرے شیخ حضرت سید عبدالستار شاہ صاحب نے شعراء کو اپنے آستانے پر طلب فرمایا اور انہیں ایک ادبی بزم قائم کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ اسی وقت بزم ادب پشتو کے نام سے ایک ادارے کے قیام کا اہتمام کیا گیا صدر سید راحت زاخیلی مرحوم، نائب صدر راقم الحروف اور ناظم خزانچی بادشاہ گل قیادت مقرر ہوا اور اس کے بعد ہر سال جنوری فروری یا مارچ میں عبدالرحمان بابا کے مزار پر اس بزم کی طرف سے مشاعرے ہونے لگے محرم اور میلاد النبی کے موقع پر حضور بادشاہ جان کے آستانے پر نعتیہ مشاعرے ہونے لگے محرم 40ء میں ایک بہت بڑا نعتیہ مشاعرہ نمک منڈی کے پارک میں جامع مسجد سے ملحق ہوا جس میں میں نے اپنی نظم "شہسوار کربلا" سنائی جس پر حاجی سمندر خان سمندر بدرشی نے اٹھ کر فرمایا میرا خیال تھا کہ حمزہ صاحب غزل کے بادشاہ ہیں اور

سب سے اچھی غزل کہتے ہیں مگر اب میں اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ نظم بھی مجھ سے بہتر لکھتے ہیں - چنانچہ میرے نعتیہ اشعار کا ایک مجموعہ "دزڑہ آواز" (صدائے دل) کی شکل میں چھپ گیا ہے جسے میرے شیخ حضور بادشاہ جان نے اپنے خرچ پر طبع کرایا ہے چنانچہ جب صد سالہ یادگار حسینی کا جلسہ سنی اور شیعہ حضرات کے اتحاد سے منعقد ہوا اور جس میں رستم خان کیانی مرحوم نے چندہ بھی دیا تھا اور جو جلسہ میں موجود بھی تھے تو وہاں پشتو کا ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جس میں میں نے یہی نظم شہسوار کربلا پڑھی تھی جس نے داد پائی تھی نظم کے بعد مولانا عبدالقادر صاحب نے جو اس مشاعرے کے صدر تھے کھڑے ہو کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا "حمزہ صاحب میرے شاگرد رہ چکے ہیں -"

1946ء میں آخری بار اجمیر شریف گیا یہ زمانہ عرس کا نہیں تھا ویسے دوسری عالمی جنگ کے دوران کئی بار مولانا عبدالقادر صاحب مرحوم نے مجھے دہلی ریڈیو میں مشاعروں کے لئے بلایا جو وہاں متعین تھے اور بعد میں دہلی کے ایک پشتو رسالہ "نن پرون" (آج کل) کی ادارت بھی انہیں سپرد کی گئی تھی جس کے لئے میں نے بھی متعدد بار نظمیں اور افسانے لکھے - اجمیر شریف سے 1946ء میں واپس آیا تو تحریک پاکستان شروع ہو چکی تھی اور میری نفسیاتی تکلیف میں معتدبہ اضافہ ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود میرے شیخ کا اصرار تھا کہ میں اس تحریک میں بھرپور حصہ لوں 'جناب امین الحسنات پیر مانکی شریف مرحوم کے ساتھ کام کرنے لگا جہاں وہ جلسہ کرتے میں نظم سناتا مگر انٹرم گورنمنٹ کے قیام کے بعد میری تکلیف میں زبردست اضافہ ہوا چنانچہ صوبہ مسلم لیگ نے مجھے ہدایت کی کہ میں خیبر ہی میں کام کروں اور آزاد پاکستان کا پروپیگنڈہ کرتا رہوں میں جامع مسجد لنڈی کوتل میں تقریباً" ہر جمعہ کے روز تقریر کیا کرتا تھا حتیٰ کہ وہ دن بھی نزدیک آگیا جبکہ پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی 'وزیر اعظم انٹرم گورنمنٹ ہند کی حیثیت سے خیبر کا دورہ کرنے والے تھے اس وقت جناب صاحبزادہ میجر خورشید خیبر کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے -

میں نے پیر صاحب مانکی شریف کو لنڈی کوتل آکر جلسہ سے خطاب کرنے کی دعوت دی پیر صاحب تشریف لائے جلسہ میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں شنواریوں کے ملک خان بہادر مراد علی خان نے بھی خطاب فرمایا آپ ملک زادہ نعمت اللہ خان کے جو (75-1974ء) میں قومی اسمبلی کے ممبر رہے والد تھے جلسہ کے بعد پیر صاحب مرحوم شلمان تشریف لے گئے جو لنڈی کوتل سے دس میل کے فاصلہ پر ورسک ڈیم کے قریب ہے اور چونکہ سرکاری طور پر پنڈت نہرو کے دورے کا کوئی اعلان نہیں ہوا تھا اس لئے اس خیال کے تحت کہ ممکن ہے کہ وہ کل ہی دورے پر آجائیں میں چند ساتھیوں کے ہمراہ جناب صاحبزادہ خورشید صاحب مرحوم کے پاس گیا اور کہا کہ آپ پنڈت نہرو کو اطلاع دیں کہ وہ خیبر آنے کی تکلیف نہ کریں - صاحبزادہ صاحب نے پوچھا کیوں تو میں نے جواب دیا انہیں نقصان پہنچنے کا احتمال ہے یہاں کے عوام سخت غم و غصہ کا اظہار کر رہے ہیں - فرمایا - کون انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے میں خود بھی ان کے ہمراہ ہوں گا - میں نے کہا کہ جناب آپ بھی نقصان سے نہ بچ سکیں گے - فرمایا 'دیکھو وہ ایک مہمان ہے آئیں گے اور چلے جائیں گے - میں نے کہا کہ جناب اگر وہ مہمان کی حیثیت سے تشریف لائیں تو ان کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں گے لیکن وہ انٹرم گورنمنٹ کے وزیر اعظم کی حیثیت سے آرہے ہیں جنہیں ہم تسلیم نہیں کرتے صاحبزادہ صاحب نے کہا کہ وہ ضرور آئیں گے کون انہیں نقصان پہنچانے کی جرات کر سکتا ہے - میں نے صرف اس قدر جواب دیا کہ انہیں آنے تو دیجئے اور واپس چلا آیا - دو دن کے بعد ہم حسب معمول بازار گئے جسے سرائے قافلہ بھی کہتے ہیں کیونکہ پہلے پہل یہاں افغانستان کے قافلے ٹھہرتے تھے کسی کو علم نہیں تھا کہ پنڈت صاحب کب آرہے ہیں ظاہر ہے کہ گاؤں کے لوگ سوائے چند دشمن داروں کے نہتے ہی آتے ہیں اتفاق سے مجھے اس دن زور کا بخار چڑھا ہوا تھا اور اپنے بڑے بھائی ملک باور خان کی جائیداد کی ایک دکان میں جو کرایہ پر اٹھی ہوئی ایک چارپائی پر دراز تھا - میرے

بھائی باور خان مرحوم جو تحریک پاکستان کے بڑے سرگرم حامی تھے آدھ گھنٹہ پیشتر پشاور روانہ ہو چکے تھے کہ اتنے میں ملک زادہ نعمت اللہ خان اور میرے دو بھتیجے شہزاد خان اور وزیر خان دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے "نہرو تو تورخم چلا گیا اب کیا کیا جائے میں اضطراری طور پر اٹھ بیٹھا اور انہیں ہدایات دیں لعل شیر حجام سے کہہ دو ڈھول لے آئے اور تم فوراً" ایک سبز پرچم بنا کر نکل آؤ چنانچہ دس منٹ میں پرچم بن کر نکل آیا اسے ہم نے منہاج الدین مرحوم کو تھما دیا لعل شیر نے ڈھول بجانا شروع کر دیا اور آن کی آن میں سڑک کے اوپر لوگوں کا اژدھام اکٹھا ہو گیا تحصیل دار نے آکر لوگوں کو منتشر کرنے کا ارادہ کیا تو عوام نے اسے مار بھگایا - چند نوجوان سر پھرے قصاب خانہ سے گائے بیل کے سر لے کر آئے اور سڑک پر رکھ گئے - میں نے انہیں منع کیا لیکن کون مانتا تھا میرے ساتھیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس اژدھام سے نکل جاؤں کیونکہ میں بیمار تھا اور گڑبڑ میں گر جانے کا خطرہ تھا سڑک سے ملحق آٹا مشین کی عمارت تھی مجھے وہاں لے جا کر ایک دیوار کے سہارے بٹھا دیا گیا جہاں سے سڑک کا نظارہ صاف نظر آ رہا تھا (چنانچہ ٹی وی والوں نے جو حال ہی میں میری زندگی پر کومنٹری ریکارڈ کی ہے اس میں اسی سڑک اور آٹا مشین کی عمارت کی فلم بھی لے لی ہے)

اب سڑک کے دونوں طرف لوگ کھڑے ہو گئے سڑک کے شمال کا حصہ ایک پہاڑی سے ملحق ہے جہاں اب عمارتیں بن گئی ہیں جب نہرو کا جلوس تورخم سے یہاں پہنچا تو دونوں طرف سے پتھروں کی بارش شروع ہوئی خیبر رائفلز کے جوان جو سب سے آگے ایک فوجی گاڑی میں سوار تھے ہوائی فائر کرنے لگے سرائے کے ایک برج پر بیٹھے ہوئے ایک آفریدی خاصہ دار نے ہمارے علمبردار سید منہاج الدین کو تاک کر گولی مار دی۔ گولی اس کے پیٹ کے دائیں طرف لگی اور اوپر ہی اوپر بائیں طرف نکل گئی علمبردار ڈگمگا گئے مگر علم کو سنبھالے رہے اور آہستہ آہستہ چلتے رہے یہاں تک کہ ریلوے لائن پر بے دم ہو کر گر پڑے میجر خورشید صاحب نے اپنی کار روک لی دیوار سے ہوائی فائر کئے مگر ایک چودہ پندرہ برس کے لڑکے نے جس کو

میجر خورشید صاحب نے تھپڑ مارا تھا جھپٹ کر میجر صاحب کی ایک مونچھ پکڑ لی اور جھٹکا دے کر اکھیڑ ڈالی 'پنڈت نہرو مع ساتھیوں کے بال بال بچ گئے اور کیمپ لنڈی کوتل میں جا داخل ہوئے جمرود کے چند آفریدی پنڈت نہرو کے لئے ہار لائے تھے ابھی پنڈت جی تورخم سے واپس نہیں لوٹے تھے کہ شنواریوں نے ان افریدیوں کو بھگا دیا -

اس مظاہرہ پر میری ایک نظم "نہرو پہ خیبر کے" (نہرو خیبر میں) یادگار کی حیثیت رکھتی ہے جب خدا خدا کر کے آزاد پاکستان کے قیام کا دن قریب آیا تو صاحبزادہ خورشید نے مجھے قیام پاکستان کے روز جھنڈا لہرانے کی تقریب میں نظم سنانے کی دعوت دی جسے میں نے منظور کیا مظاہرہ کے بعد میرے بھتیجوں اور ملک زادہ نعمت اللہ خان کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا تھا شنواری قوم پر چند ہزار روپے جرمانہ کیا گیا - جو ان کے مواجب سے وضع کر لیا گیا۔

اگست کے مہینے میں روزے آگئے تھے اس لئے پشاور کی شدید گرمی سے بچ کر حضور بادشاہ جان لنڈی کوتل تشریف لے آئے تھے 14 اگست کا بڑی شدت سے انتظار تھا میرے ایک دوست ملا عبدالصمد مرحوم بھی یہاں روزے گزارنے آئے تھے جو میرے دوست تھے اور دوستی کی بنیاد کیمیا گری کا شوق تھا جس کا بعد میں ذکر آئے گا وہ نہ صرف خوخصلت کے لحاظ سے بلکہ شکل وصورت سے بھی ایک عجوبہ تھے ایک آنکھ کسی مرض کا شکار ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اور دوسری آنکھ میں پھولا تھا جس سے بمشکل راستہ نظر آتا ہے بایاں پاؤں پیدائشی ٹیڑھا تھا اس لئے لنگڑا کر چلتے تھے ویسے بے حد خوبصورت آدمی تھے مومند قوم سے تعلق رکھتے تھے - آٹے کی دکان کرتے تھے اور بہت سخی آدمی تھے -

حضور بادشاہ جان رات کو نماز عشاء کے بعد کچھ وقت کے لئے قوالی سنا کرتے تھے یہاں بھی انتظام موجود تھا - 14 اگست کی رات کو گیارہ بجے شب تک محفل سماع رہی اور پھر ہم سب یہاں حضور کے ساتھ بارہ بجے شب کا انتظار کرنے لگے ہر طرف خاموشی چھا گئی عبدالرشید بادشاہ مرحوم بھی جو حضور کے مرید تھے جن

کے گرد انظاری کے بعد چرسیوں کی چہل پہل ہوا کرتی تھی خاموش تھے وہ موضع بی کوٹ واقع افغانستان کے اخون موسیٰ کی اولاد میں سے تھے جو نسلاً" سید تھے عجیب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے باتوں کے بادشاہ تھے ہمیشہ اجمیر شریف رہا کرتے تھے کئی ہندو ان کے مرید تھے وہ بھی ملا عبدالصمد کی طرح عجیب ہیئت کذائی رکھتے تھے سر کے بال لمبے تھے ایک پاؤں کا پنجہ پیدائشی ابھرا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سے بھی لنج تھے ایک دن گرمیوں میں بغیر قمیض پہنے، ننگے سر سرائے سے باہر آرہے تھے میرا لڑکا مراد علی خان بچہ تھا اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا "بادشاہ صاحب تم تو صاف طور پر جن لگ رہے ہو" اس پر خود بادشاہ جان مسکرائے کبھی کبھی وہ اس کا تذکرہ بھی فرمایا کرتے تھے طنز کے ماہر تھے کبھی کبھی موج میں آتے تو حضور بادشاہ جان کو بھی خاطر میں نہ لاتے اور جو جی میں آتا کہتے چلے جاتے حضور ان کی ناز برداری کیا کرتے تھے میں نے ایک دن ٹوکا۔ فرمایا اے شنواری تم کیا جانو حضور کو، حضور کو تو میں جانتا ہوں ایک دن اجمیر شریف سے سرواڑ گئے (سرواڑ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے فرزند خواجہ فخر الدین کا مزار ہے راقم الحرف نے بھی وہاں ایک بار حاضری دی ہے) تو میں نے حضور کی خدمت میں عرض کی کہ "حضور وہ جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ہم اہل بیت کو اللہ نے وہ اسرار دیئے ہیں جو بنی اسرائیل کے انبیاء کو بھی نہیں دیئے تو ہم بھی تو ان کی اولاد میں ہیں ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں"۔ حضور نے فرمایا کہ "ہاں یہ ضروری نہیں کہ تمام سادات صاحب اسرار ہوں لیکن وہ خصوصی اسرار سادات میں موجود ضرور ہوتے ہیں" میں نے کہا کہ حضور آپ کے پاس بھی کچھ ہے مسکرا کر جواب دیا خدا کا فضل ہو تو سب کچھ ممکن ہے اور پھر حضور نے اپنی پیٹھ ننگی کردی اور ایک خشک درخت سے لگا دی اور فرمایا "آئندہ سال آکر اس درخت کو ملاحظہ کرو" چنانچہ میں نے اپنے حقے کی چلم اس درخت کی جڑوں کے پاس دبا دی اور واپس اجمیر شریف چلے آئے۔ جب دوسرے سال سرواڑ شریف

پہنچے تو سب سے پیشتر فاتحہ کے بعد میں اس سوکھے درخت کی تلاش میں چلا۔ مگر وہاں مجھے کوئی سوکھا درخت نظر نہ آیا میں نے حقے کی اس چلم کی تلاش شروع کردی چونکہ وہاں گھاس بہت زیادہ اگ آئی تھی اس لئے تلاش میں کچھ وقت صرف ہوا آخر کار چلم درخت کی جڑوں میں مل گئی جو آدمی سے زیادہ زمین کے اندر دھنسی ہوئی تھی مگر وہ درخت سرسبز تھا تو اے شنواری! میں حضور سے لڑتا بھی ہوں مگر ان کی قدر جیسے میرے دل میں ہے تمہیں اس کی خبر تک نہیں۔"

یہ عبدالرشید بادشاہ کا بیان ہے جو اس وقت قیام پاکستان کی خوشی میں اپنے چرسی ساتھیوں کے ساتھ خاموش بیٹھا انتظار کررہا تھا عجیب بات تو یہ ہے کہ ہمارے اردگرد کے دوسرے دیہات میں بھی خاموشی تھی کہ اس اثناء میں لنڈی کوتل کیمپ سے بارہ بجے کا گھنٹہ اور اس کے ساتھ ہی مبارک مبارک کا شور سنائی دیا ہم میں سب سے پیشتر ملا عبدالصمد نے حضور بادشاہ جان کو قیام پاکستان کی مبارک باد پیش کی اور پھر ہر طرف سے مبارک مبارک کی صدائیں بلند ہونے لگیں ایک نیا اسلامی ملک معرض وجود میں آگیا تھا ہاں وہ پاکستان جو اسلام کے مقدس نام پر بنا تھا اور جس کی بنیادوں کو لاکھوں مسلمانوں کے خون اور سینکڑوں خواتین کے خون عصمت سے اٹھایا گیا تھا جس کا مطلب تھا **لا الہ الا اللہ** جس میں مسلمان اسلامی اصولوں کی روشنی میں زندگی بسر کریں مگر آہ

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مسلم لیگ ہی کی حکومت میں اقدار کفریہ کو فروغ ہونے لگا وہ مسلم لیگ جس کا نعرہ یہ ہوا کرتا تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا **لا الہ الا اللہ** اور یا یہ کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" مسلم لیگ میں آئے پاکستان بنا، لیکن پاکستان اسلامی پاکستان نہ بن سکا، یکے بعد دیگرے کئی حکمران برسراقتدار آئے جو زبان سے تو اسلام اسلام پکارتے نہ تھکتے تھے۔ مگر عملی طور پر شجر اسلام کی جڑیں کاٹ رہے تھے اس ضمن میں یاد آیا کہ جب صدر ایوب خان نے پاک اسپیشل جمہوریت میں ایک جتھے کا

دورہ کراچی سے پشاور تک کیا تھا تو پاکستان رائٹرز گلڈ نے پشتو رائٹرز کی حیثیت
سے مجھے بلایا تھا اور میں نے اس دورے میں صدر مذکورہ کے ساتھ تھا صدر ایوب
جگہ جگہ لوگوں کے حالات پوچھتے اور ان کے سوالوں کا جواب دیتے' چنانچہ غالباً"
بہاول پور میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا "صدر صاحب پاکستان اسلام کے نام
پر بنا تھا اور قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ اس میں اسلامی نظام نافذ ہوگا مگر اب تک
نافذ نہ ہوا" - صدر ایوب نے جواب دیا "او بے وقوف تم ابھی تک ان امور سے
چمٹے ہوئے ہو جو چودہ سال پہلے تھے' بیٹھ جاؤ" مگر مزے کی بات یہ ہے کہ جب
تقریر کرتے تو پہلے بسم اللہ الرحمان الرحیم پڑھتے غرضیکہ مغرب کی ملحدانہ تعلیم کو شہ
دی اور اب حالت یہ ہے کہ کچھ لوگ کھلم کھلا اسلام کو ایک فرسودہ نظام کہتے
ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں-

14 اگست کی صبح پولیٹکل ایجنٹ صاحبزادہ خورشید کے دفتر پہنچا جھنڈا
لہرانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں آفریدی اور شنواری شلمان و ملاگوری کے سفید
ریش دوسرے ملک بھی مدعو کئے گئے تھے صاحبزادہ خورشید نے تقریر کرتے ہوئے
کہا کہ میں اسلامی ملک پاکستان کا جھنڈا لہرانے سے پیشتر آپ سے سوال کرتا ہوں
اگر آپ اس اسلامی علم کی حفاظت کا وعدہ کریں تو میں جھنڈا لہرا دوں گا تمام ملکوں
اور سربر آوردہ افراد نے بیک آواز اس کی حفاظت کا وعدہ کیا جھنڈا لہرانے کے بعد
مجھے نظم سنانے کی دعوت دی گئی میں نے اس موقعے پر جو نظم سنائی جس کا عنوان
تھا "نشان پاکستان-"

اس سے قبل ریفرنڈم ہو چکا تھا جس کا مدعا یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے لوگ
بھارت میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں - میں نے خود اس میں حصہ لیا لیکن
خدائی خدمت گار جماعت نے ریفرنڈم کا بائی کاٹ کیا-

1948ء کے اگست میں افغانستان کی پشتو اکیڈمی کی طرف سے سرحد کے
ادیبوں کو جشن استقلال افغانستان میں شمولیت اور پشتو رسم الخط کے متعلق بات

چیت کی دعوت دی گئی جس میں میرا نام بھی شامل تھا - وفد کے ارکان میں مولانا
عبدالقادر' حکیم عبدالخالق خلیق' محمد نواز خٹک' ڈاکٹر انوار الحق' خان میر ہلالی'
میاں سید رسول رسا اور ملک سیدا خان شنواری اور راقم الحروف شامل تھے-

ایک دن (اگست 48) پاسپورٹ کے سلسلے میں میاں جعفر شاہ صاحب سے ملے جو
خان عبدالقیوم خان وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کی کابینہ کے وزیر تھے ابھی ہم باہمی دلچسپی
کے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ چارسدہ موضع بابڑہ میں پولیس کے گولی چلانے کی
اطلاع ملی اطلاع میں کہا گیا تھا کہ سینکڑوں لوگ قتل اور زخمی ہو گئے ہیں تھوڑی
دیر تک خاموشی رہی پھر میاں جعفر شاہ صاحب نے کہا کہ میں نے قیام پاکستان کے
بعد ہی ڈاکٹر خان صاحب سے کہہ دیا تھا کہ اب چونکہ پاکستان حقیقت بن چکا ہے
اس لئے مزاحمت سے باز آجانا چاہئے ان ہی حالات میں قائد اعظم نے ڈاکٹر خان
صاحب کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی اور ساتھ ہی فرمایا کہ ان کی
وزارت بھی محفوظ رہے گی چنانچہ ڈاکٹر خان نے میرا مشورہ پسند کیا مگر جب بادشاہ
خان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اسے رد کر دیا اور فرمایا کہ یہ دعوت جناح
صاحب نے بھی انہیں دی تھی مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ جمہوری
ممالک میں ایک سے زیادہ پارٹیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ہم بھی پاکستان کی
خدمت کریں گے-

اب اس ضمن میں ایک بات یاد آگئی ہم خوشحال خان سیمینار کے سلسلے
میں کابل بلائے گئے تھے غالباً" یہ پہلا سیمینار تھا جس میں کوئٹہ کے ادیب بھی شامل
تھے میں نے خوشحال خان خٹک کے تصوف پر تقریر لکھی تھی چنانچہ ایک دن ہم
ریاست قبائل میں ساتھ بیٹھے تھے کہ خان عبدالغفار خان بھی تشریف لے آئے
دوران گفتگو رئیس قبائل نے کہا "بادشاہ خان! خان قیوم اور آپ کی مخالفت کی
وجوہات کیا ہیں"

بادشاہ خان نے کہا کہ میں بیان کروں گا اور خوش قسمتی سے حمزہ شنواری

بھی یہاں موجود ہے جو کٹر مسلم لیگی رہ چکا ہے اگر میں نے کسی غلط بیانی سے کام لیا تو اسے ٹوکنے کا حق حاصل ہے کہنے لگے ، "عبدالقیوم خان میری سفارش سے کانگریس پارلیمانی پارٹی کے نائب مقرر ہوئے تھے انہوں نے انگریزی میں میرے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے پاکستان بننے کے بعد میں نے کراچی میں حلف وفاداری اٹھایا اور جناح صاحب کو میں نے اپنے مرکز سردریاب چارسدہ آنے کی دعوت دی تاکہ خدائی خدمت گار انہیں سلامی پیش کریں اور جناح صاحب نے اس دعوت کو منظور کرلیا مگر اس سے قیوم خان کو یہ خوف لاحق ہوگیا کہ اگر قائد اعظم کے تعلقات خان عبدالغفار خان سے استوار ہوگئے تو سرحد میں اقتدار کی باگ ڈور قیوم خان کے منشاء کے خلاف ہوگی لہٰذا اس نے قائد اعظم کے پاس جاکر کہا کہ خدائی خدمت گاروں کے علاقہ میں جانا خطرے سے خالی نہیں - لوگ ہندوؤں کے دوست اور پاکستان کے شدید مخالف ہیں لیکن قائد اعظم نے قیوم خان کی بات تسلیم نہیں کی اور فرمایا کہ پٹھانوں کی فطری غیرت اور مہمان نوازی سے یہ بعید ہے کہ وہ اپنے بلائے ہوئے مہمان کو نقصان پہنچائیں - میں ضرور سردریاب جاؤں گا چنانچہ قیوم خان یہاں سے ناکام ہوکر سرحد کے گورنر کننگھم کے پاس پہنچے اور اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی مسٹر کننگھم نے قائد اعظم کو مطلع کیا کہ خان قیوم کی بات صحیح ہے اور آپ کو خدائی خدمت گاروں سے خطرہ ہے چنانچہ جناح صاحب نے وہ دورہ ملتوی کردیا -

مشہور سوشلسٹ لیڈر کاکاجی صنوبر حسین پاکستان بن جانے کے بعد علاقہ غیر سے واپس آگئے تو انہوں نے پشتو رسالہ اسلم جاری کیا اسلم دراصل آپ کا ایک بہادر ساتھی تھا جو غالباً" انگریزوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوگیا تھا میں بھی اسلم کے لئے لکھنے لگا اور پھر کاکاجی کے مشورے سے اولسی ادبی جرگے کا قیام عمل میں آیا جس کا پہلا صدر میں ، ناظم دوست محمد خان کامل مومند اور خزانچی افضل بنگش مقرر ہوئے اس جرگے کی زیر قیادت پشتو ادب میں خصوصی طور پر انتقاد نے

خوب پیشرفت کی اس جرگے کی پہلی ادبی نشست میں تنقید کے لئے میں نے اپنی غزل پیش کی - جرگے میں مختلف سیاسی و مذہبی عقائد کے افراد شامل تھے کیمونسٹ ، صرف لامذہب ، قوم پرست اور اسلام سے محبت کرنے والے - افضل بنگش اور کاکا جی کیمونسٹ تھے - قلندر مومند بھی اس وقت کیمونسٹ تھے اور شدید کیمونسٹ تھے یہاں تک کہ جب میں نماز پڑھنے کے لئے اجلاس سے اٹھتا تو پھبتیاں اڑاتے مگر گرفتار ہونے کے بعد قلعہ لاہور میں نظربندی کے دوران وہاں ایک شخص سے ایسے متاثر ہوئے کہ اسلام سے محبت کرنے لگے اور پھر خصوصی طور پر حضرت علی علیہ السلام کی افضلیت کے قائل ہوئے جیسے کہ میں بھی ہوں اور چونکہ وہ ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مذہبی علوم گویا انہیں اپنے گھر میں حاصل ہوئے تھے اس لئے بڑے پکے مذہبی بن گئے بعد میں اپنے بزرگوں کے اصرار پر خلیفہ قادیان سے بھی بیعت فرمائی اور اب کٹر احمدی ہیں -

میں اور دوست محمد خان کامل مذہب اور قومیت کے امتزاج پر عقیدہ رکھتے تھے ہم قومیت کو اسلام کے خلاف نہیں سمجھتے تھے بشرطیکہ قومیت اسلامی اصولوں سے متصادم نہ ہو۔ ہمارا عقیدہ تھا کہ اسلام تمام اقوام کو اپنی اجتماعیت میں جگہ دینے اور انہیں ترقی دینے کا حامی ہے بشرطیکہ اقوام اسلام کے اجتماعی نظام سے متفق ہوں -

اولسی ادبی جرگہ کے تنقیدی اجلاس دوست محمد خان کامل مومند کے بالا خانے پر ہوا کرتے تھے اور چونکہ آپ ایک بڑے محقق کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب وکیل بھی تھے اس لئے وہاں موکلوں کو بھی وقت دیا کرتے تھے سی آئی ڈی کا آدمی پہلے اجلاسوں کے دوران چپکے سے آکر دروازے کے باہر کھڑا ہوتا تھا اور جو کچھ سن پاتا لکھ لیتا ہمیں معلوم ہوا تو اسے کھلے اجلاس میں بیٹھنے کی اجازت دی اور پھر وہ بے تکلف ہوکر آتا اور جو کچھ چاہتا نوٹ کرجاتا ہماری نگرانی اس لئے ہورہی تھی کہ حکومت کے خیال میں ہر پشتو ادیب و شاعر انٹی پاکستانی تھا شاید اس

کی وجہ حکومت افغانستان کا وہ پروپیگنڈہ ہو جو پختونستان کے سلسلے میں کیا جاتا تھا کچھ بھی ہو ہماری کڑی نگرانی ہو رہی تھی اس ایک آدمی کے علاوہ جو صرف ادبی اجلاس کی روداد نوٹ کیا کرتا تھا ہم سب کی نگرانی کے لئے علیحدہ علیحدہ افسر مر مقرر کئے تھے میرے ساتھ تو سی آئی ڈی کا افسر مرگھر تک جاتا تھا چنانچہ ایک دن میں نے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس سے کہا "بھائی اب تو میں اندر جا رہا ہوں کیا آپ بھی اندر آنا چاہتے ہیں" میں زیادہ تر وقت اپنے شیخ سید عبدالستار شاہ صاحب کے مزار پر گزارا کرتا تھا چنانچہ ایک افسر مرکو اس وجہ سے نوکری سے برخاست کیا گیا کہ اس کی رپورٹوں میں اکثر یہی ہوا کرتا تھا سید عبدالستار شاہ کے مزار پر رہا گیارہ بجے گھر آیا دو بجے نماز کے لئے مسجد گیا وغیرہ وغیرہ۔

اب عبدالرحمان بابا کے مزار پر مشاعرے اولسی ادبی جرگے کے زیر انتظام ہونے لگے اور سال بہ سال سامعین کی تعداد بڑھتی رہی لہٰذا مشاعرے کے پروگرام کے لئے دو دن متعین کئے گئے ایک دفعہ پشاور سے رحمان بابا تک اولسی ادبی جرگے نے بجلی پہنچانے کا انتظام کیا حالانکہ شدید بارش ہو رہی تھی۔

ویسے مذہب اور قومیت کے متعلق مجھ میں اور کامل صاحب میں مکمل اتفاق تھا مگر بعض مذہبی مسائل میں ہمیشہ اختلاف رہا کامل صاحب تصوف کے مخالف تھے خصوصاً" مسئلہ وحدۃ الوجود کے شدید مخالف تھے اور میں حامی بلکہ داعی تھا اس لئے ایک دفعہ مولانا عبدالقادر صاحب نے بھی مجھ سے فرمایا تھا کہ تم اس عصر کے پیر تاریک (پیر روشن) ہو اور چونکہ مولانا عبدالقادر صاحب بھی کامل مومند صاحب کی مانند حنبلی مذہب سے متاثر تھے اس لئے ان کا اختلاف بجا تھا گو کبھی کبھی کامل صاحب کے سامنے جب اپنے طور پر مسئلہ وحدۃ الوجود کی وضاحت کرتا تو فرماتے "آپ کا مزعومہ وحدۃ الوجود تو کسی قدر گوارا نظر آتا ہے مگر عام طور پر اس مسئلے کی جو توجیہہ کی جاتی ہے وہ تو صریحاً" شرک ہے"

بایزید روشن ضمیر صوفی تھے وحدۃ الوجود کے داعی تھے۔ اور جب تک ان

کی کتابیں منظر عام پر نہ آئی تھیں اور ان کے شاگردوں ملا ارزانی ' دولت لوانڑے اور مرزا خان انصاری کے دیوان شائع نہ ہوئے تھے عام طور پر لوگ اخوند درویزہ کے ان الزامات کو صحیح تصور کرتے تھے جو انہوں نے پیر روشن پر لگائے تھے اور انہیں شہنشاہ اکبر کے وزیر اعظم ابوالفضل کے اشارہ پر روشن سے تاریک بنا دیا تھا مگر مولانا عبدالقادر صاحب جب پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور کے ڈائریکٹر تھے تو کوشش کرتے تھے کہ پیر روشن کی کتاب خیرالبیان کہیں سے دستیاب ہو انگلینڈ گئے وہاں نہ مل سکی جرمنی گئے برلن میں بھی نہ مل سکی مگر انہیں ہدایت کی گئی کہ عالمی جنگ کے دوران برلن سے لائبریری کا معتدبہ حصہ دوسرے چھوٹے سے شہر ٹوبنگن میں منتقل کیا گیا لہٰذا وہاں تلاش کریں وہاں سے خیرالبیان مل گئی اور اس کی فوٹو سٹیٹ کاپی منگوائی گئی اور پھر پشتو اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوئی دولت اور مرزا خان انصاری کے دیوان بھی شائع ہوئے ' پڑھنے سے معلوم ہوا کہ پیر روشن کٹر سنی حنفی تھے لیکن تعجب ہے کہ اخوند درویزہ صاحب نے چشتی نظامی ہونے کے باوجود مسئلہ وحدۃ الوجود کی وجہ سے پیر روشن کو تاریک کیسے کہا ' حالانکہ چشتی نظامی بھی سلسلہ وحدۃ الوجود کا داعی ہے۔

1948ء کے جشن کے لئے جیسا کہ ذکر ہوا ہمارا ایک وفد کابل گیا تھا پشتو رسم الخط کے متعلق وہاں کے ادبا سے تبادلہ خیالات ہوا اور ہم رسم الخط پر تقریباً" متفق ہو گئے۔ واپس آنے کے بعد میں نے کابل کا منظوم سفرنامہ لکھا جو سو اشعار پر مشتمل تھا اور جسے عبدالخالق خلیق صاحب نے شائع کرانے کے لئے کاتب کے حوالہ کیا لیکن کتابت کے بعد ضرورت یہ درپیش آئی کہ اسے سرکاری احتساب کے لئے پیش کیا جائے۔ پیش ہونے کے بعد جگہ جگہ سے چند بند ہٹانے کی ہدایت ہوئی جس پر وہ شائع نہ کیا جا سکا کیونکہ ان اشعار کے بعد نظم اور واقعات کا تسلسل بری طرح متاثر ہو سکتا تھا چنانچہ اس کی نقل میرے پاس موجود نہیں۔ شاید کاتب میاں اسرار الدین کے پاس موجود ہو۔

قیام پاکستان کے بعد میری تکلیف میں مزید اضافہ ہوا اور میں اپنے ایک پیر بھائی میاں قائم شاہ کے ساتھ رہنے لگا - جو توپ خانہ بازار پشاور چھاؤنی میں رہائش پذیر تھا بینائی کی کمزوری کی وجہ سے اسے پولیس لائن سے ہٹا کر کہیں چپڑاسی لگا دیا گیا تھا چونکہ میری بیوی کا انتقال ہوگیا تھا اس لئے بے گھر تھا کبھی کبھی بڑی مشکل سے مرشد کے حضور میں حاضری دیتا تھا چلنے پھرنے سے تقریباً" رہ گیا تھا قائم شاہ دفتر چلا جاتا اور میں تمام دن گھر پر پڑا رہتا اور ملک الموت کا انتظار کرتا کبھی کبھی دس پندرہ منٹ کے لئے باہر بھی آجاتا اس گھر کے ساتھ ہی ایک سکھ کی دکان تھی اس نے قائم شاہ سے میرے متعلق پوچھا تھا - اس نے جواب دیا تھا کہ صوفی ہے اور گوشہ نشین ہوگیا ہے چنانچہ ایک دن اس بھاری بھرکم سکھ دکاندار نے کہا کہ "خان صاحب! ہم پر بھی تو کچھ نگاہ ہو" - میں نے کہا کہ سردار صاحب یہاں کیا دھرا ہے زندگی کے دن پورے کررہا ہوں - مگر وہ اصرار کرتا رہا آخر مجبور ہو کر میں نے اسے شغل میت بتا دیا - شغل میت رات کو سوتے وقت یوں کیا جاتا ہے کہ انسان تصور کرتا ہے کہ وہ بیمار ہوگیا - علاج کے لئے ڈاکٹر طلب کیا علاج ہونے لگا - مگر آفاقہ نہیں ہوا - مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی - آخر میں ڈاکٹر نے جواب دے دیا اور پھر عالم نزع شروع ہوا بیوی بچے سرہانے کھڑے رو رہے ہیں ایک آخری ہچکی آئی اور روح پرواز کرگئی کریا کرم ہونے لگا اور آخر اس کی لاش لے جاکر چتا پر رکھ دی گئی اور آگ لگا دی گئی سردار جی دو دن کے بعد گھر سے باہر نکلا تو وہ کچھ دبلا پتلا اور زرد رو نظر آیا پوچھا سردار جی کیا حال ہے جواب دیا خان صاحب ایسے کام سے توبہ ہے میں تو سچ مچ مرنے لگا تھا -

میرے دوستوں میں سید عنایت علی شاہ، ضیاء جعفری اور ان کے دوست اور شاگرد عبدالودود قمر تھے انہوں نے دائرہ ادبیہ کے نام سے ایک بزم قائم کی تھی - مزار شاہ ولی قتال سے ملحق ایک بیٹھک لی جس میں ان کی نشست ہوا کرتی - میں پشاور میں ہوتا خصوصاً" موسم سرما میں تو ضرور وہاں حاضری دیتا اور دس گیارہ

بجے شب واپس آجاتا - ضیاء صاحب مرحوم اپنے وقت کے بہترین شاعر تھے پہلے اثنا عشری تھے بعد میں قادریہ مسلک کے صوفی بنے اور کچھ عرصہ بعد بریلی شریف میں حضرت خواجہ نیاز کے سلسلے سے بھی منسلک ہوگئے گویا اس لحاظ سے ہمارے ہم سلسلہ ہوگئے ہمارا سلسلہ بھی چشتیہ نظامیہ نیازیہ ہے اللہ مغفرت کرے میں انہیں کبھی کبھی بہت ستایا کرتا - خصوصاً" اس زمانے میں جبکہ میں الحاد کی رو میں بہہ رہا تھا عجیب و غریب اعتراضات کرتا کبھی کہتا کہ ضیاء صاحب آپ سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، فرماتے "کیسے" جواب دیتا، "سنی تو اس لحاظ سے کہ آپ تصوف سے تعلق رکھتے اور شیعہ تصوف کی طرف کبھی میلان نہیں رکھتے پھر یہ کہ آپ حضرات ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے بے شمار فضائل بھی بیان کرتے ہیں اور جناب غوث پاک کے سلسلۂ قادریہ سے منسلک ہونے کی حیثیت سے غوث پاک کو مرشد روحانی سمجھتے ہیں حالانکہ حضرات شیعہ ان کے شدید مخالف تھے اور آپ شیعہ اس لحاظ سے ہیں آپ حضرت علی - ائمہ اہل بیت کو تمام امت سے افضل سمجھتے ہیں - یزید و معاویہ وغیرہ کو مسلمان نہیں سمجھتے -"

ضیاء صاحب کا خاصا تھا کہ آپ بزرگوں کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے اور اکثر جوتیوں میں تشریف رکھتے بے حد خوبصورت جوان تھے چنانچہ میں کبھی کبھی طنزاً" انہیں کہتا کہ آپ کے لئے سب سے بڑا بت آپ کی خوبصورتی ہے - اسی طرح آپ حضور بادشاہ جان کی خدمت میں بھی ضرور حاضر ہوتے اور وہاں ہی ہماری دوستی کی ابتداء ہوئی - آپ کی مادری زبان چونکہ پشتو تھی اس لئے وہ حضور بادشاہ جان کی محفل میں میری پشتو غزلیں سنتے تو بہت داد دیتے حضرت عبدالودود قمر ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتے جو اب وفات پاچکے ہیں شاید ضیاء صاحب سے عمر میں کچھ بڑے تھے اور ان کی شادی بھی پکی عمر میں ہوئی تھی میں نے پشتو میں اس کا سہرا لکھا تھا بے حد صاحب اخلاق منہ پر حق بات کہنے والے محب اہل بیت حالانکہ خود بھی علوی تھے مگر بنو فاطمہ کی غلامی باعث فخر جانتے تھے گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت

عباس علمدار کے اخلاق سے نوازا تھا۔

جنگ عظیم دوم کے دوران روس کے عظیم عالم حضرت موسیٰ جار اللہ صاحب ہوٹل تاج محل بیرون ڈبگری بازار پشاور میں نظر بند تھے نظر بندی کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ والئے افغانستان کو لکھا کہ اگر انہیں تھوڑی سی فوج بھی دی جائے تو وہ بخارا پر قبضہ کرلیں گے کیونکہ وہاں کے باشندے ان کے معتقد ہیں سوئے اتفاق سے وہ خط سی آئی ڈی کے ہاتھ آگیا اور آپ کو نظر بند کردیا گیا ان کی خدمت میں ہمیشہ فارغ التحصیل علماء کا جمگھٹا رہتا اور ان سے علمی استفادہ کرتا چنانچہ میں بھی خدمت میں حاضر ہونے لگا اور ہوتے ہوتے اچھے تعلقات قائم ہوگئے بات چیت فارسی میں ہوتی تھی اور میں ٹوٹی پھوٹی فارسی میں اپنا مقصد بیان کردیا کرتا تھا چنانچہ ایک دن جب میں نے پوچھا "مولانا آپ کی تعلیم کہاں تک ہے" مسکرا کر فرمایا اور دنیا میں کوئی ایسا بڑا علمی ادارہ نہیں جس کا دروازہ میں نے نہ کھٹکھٹایا ہو۔ اور پھر اپنی ڈگریوں کو شمار کرنے لگے اور میں حیرت سے سنتا رہا، معلوم ہوا کہ انہوں نے عربی زبان میں 118 کتابیں لکھی ہیں میں نے پوچھا کہ مولانا آپ داڑھی کیوں منڈواتے ہیں فرمایا "اپنی بہترین عقل کو اس قسم کے معمول مسائل میں نہ الجھایا کرو۔ داڑھی لباس کی قسم سے ہے" میں نے کہا کہ مولانا! عریاں رہنا بھی تو اچھا نہیں ہوتا۔ مسکرا کر فرمایا "عریانی بھی لباس ہی کی ایک قسم ہے"۔

موسیٰ جار اللہ صاحب سے ضیا صاحب کے تعلقات بھی قائم ہوگئے چنانچہ ایک دن انہیں دائرہ ادبیہ میں مدعو کیا گیا، میں بھی ساتھ تھا وہاں جو نوجوان شعرا تھے، وہ ذرا آزاد واقع ہوئے تھے اس لئے واپسی پر مجھ سے فرمانے لگے "یہ دائرہ ادبیہ تھا، میں نے تو وہاں کوئی ادب نہیں دیکھا" میں نے عرض کیا، "وہ آپ کی عظمت اور کارناموں سے بیگانہ تھے، آپ ان سے صحیح طور پر متعارف نہ ہوسکے"

یہ 1941-42ء کا زمانہ تھا اور موسیٰ جار اللہ صاحب نے اردو کے ساتھ

ہی ساتھ پشتو بھی کسی حد تک سیکھ لی تھی اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی گٹھے جسم کے میانہ قد انسان تھے پشتو کے رسالہ "نن پرون" میں پشتو رسم الخط کے متعلق بحث چل رہی تھی مولانا عبدالقادر نے تجویز پیش کی تھی کہ کیوں نہ پشتو آئندہ کے لئے اردو رسم الخط میں لکھی جائے اس بحث میں مخالف اور موافق ہر دو قسم کی آرا کا اظہار ہو رہا تھا چنانچہ پشتو کے موجودہ رسم الخط کی حمایت میں لکھنے سے قبل حضرت موسیٰ جار اللہ سے رائے لی، فرمایا "موجودہ رسم الخط برقرار رکھو تمہارے پشتو کا رسم الخط قرآن کا رسم الخط ہے ترکوں نے اسے ترک کیا تو قرآن ان کے ہاتھ سے جاتا رہا تم ترک کروگے تو تم سے بھی جاتا رہے گا۔"

ان کے پاس قاری علی تجمل صاحب بھی آیا کرتے تھے جو ریڈیو سے منسلک تھے سید بھی تھے اور شاعر بھی کہیں انہوں نے موسیٰ جار اللہ صاحب سے کہہ دیا کہ حمزہ شیعہ ہے چنانچہ ایک دن انہوں نے پوچھا میں نے سنا ہے کہ تم شیعہ ہو۔ میں نے جواب دیا مولانا صرف تفضیلی ہوں، فرمایا اوہ میں تو خود بھی تفضیلی ہوں اور میں علی علیہ السلام کو صحابہ سے افضل سمجھتا ہوں مگر علامہ جمال الدین افغانی کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں، کہ خلافت خاصہ اہل بیت ہے میں نے کہا کہ مجھے تو افغانی صاحب کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے فرمایا "دلیل" میں نے کہا کہ مولانا کہاں مجھ جیسا ناچیز۔ بے علم اور کہاں آپ جیسے علم و فضل کے بحر بے کراں میں آپ کے سامنے کیسے دلیل پیش کرسکتا ہوں مسکرا کر کہنے لگے "نہیں نہیں آخر تیرے ذہن میں کچھ تو ہوگا جبھی تم خلافت کو اہل بیت سے مختص سمجھے ہو گھبرانے کی ضرورت نہیں صاف صاف کہہ دو میں نے کہا کہ ایک عقلی دلیل تو ہے۔ فرمایا بیان کرو، میں نے عرض کیا "آپ آنحضرت صلعم کو تمام انبیاء سے افضل سمجھتے ہیں۔ فرمایا ہاں، عرض کیا پھر اللہ نے آخری اور کامل نبی تو نہ روس میں پیدا کیا نہ امریکہ اور لندن میں انہیں ایک جاہل اور خونخوار قوم میں پیدا کیا جس سے صاف مترشح ہے کہ عرب قوم آنحضرت صلعم کے پیغام کو قبول کرنے اور اسے دنیا بھر میں پھیلانے کے

لئے تمام دیگر اقوام سے زیادہ موزوں تھی اور علم الٰہی میں یہی متعین تھا لہٰذا ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے عرب دنیا کی تمام اقوام سے بہتر ہیں" مسکرا کر فرمایا "شاباش آگے بڑھو" عرض کیا، پھر عرب اقوام اور قبائل میں بھی آنحضرت کا قریش میں پیدا کرنا ثابت ہے کہ قبیلہ قریش تمام دیگر عرب قبائل سے افضل تھا جیسے کہ تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیگر عرب قبائل قریش کی بزرگی کے قائل تھے پھر قریش کے اندر بنو ہاشم میں آنحضرت صلعم کا پیدا ہونا ثابت کرتا ہے کہ قریش سے بھی بنو ہاشم افضل تھے لہٰذا معلوم ہوا کہ علم الٰہی میں بنو ہاشم ہی وہ برگزیدہ قبیلہ ہے جو دنیا بھر کے قبائل سے فضیلت میں بڑھا ہوا ہے اس لئے ضروری ہے کہ خلافت بھی اسی میں رہے اور اگر واقعی خلافت اسی میں رہتی تو آئندہ مسلمانوں میں جو فرقہ بازی ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے یہ واقع نہ ہوتی۔ ہنسنے لگے فرمایا اس دلیل سے اپنا جی خوش کرتے رہو ہم اسے تسلیم نہیں کرتے پھر یکایک میرے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے فرمانے لگے "ابو المراد، معلوم ہوتا ہے کہ تیری دنیا کچھ تنگ ہے" میں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر فرمایا یہ تیری قوم کا گناہ ہے میں نے مصر کے ایک مشہور شاعر سے تبادلہ خیال کیا ہے جس کے خیالات اگر تم سے کم نہ ہوں تو بڑھ کر تو ہرگز نہیں مگر قوم نے اس کے لئے ایک محل بنا دیا ہے میں نے کہا کہ مولانا میری قوم مصری قوم سے بڑھ کر غیور اور سخی ہے مگر ابھی وہ اس مقام تک نہیں پہنچی کہ علم و ادب کی قدر کر سکے ہاں مجھے یقین ہے کہ اس مقام تک پہنچنے کے بعد وہ میرے فن کو آب زر سے لکھ کر شائع کرے گی۔

موسیٰ جار اللہ کی شہرت سے گھبرا کر حکومت نے انہیں بھوپال منتقل کر دیا مگر وہاں بھی ملاقاتیوں کا ہجوم رہنے لگا چنانچہ کچھ عرصہ بعد انہیں مصر بھیج دیا گیا اور انہوں نے مصر ہی میں وفات پائی۔

کیمیا گری اور میں

انسان فطرتاً متجسس واقع ہوا ہے اور یہی اس کی ترقی کا راز ہے گو وہ ارتقاء کی اس فطری تحریک کے تحت کبھی کبھار دور از کار اور لاحاصل اشغال بھی اختیار کر لیا کرتا ہے مگر تلخ تجربہ سے دوچار ہونے کے بعد اپنی سمت تبدیل کر لیتا ہے۔

کیا دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اگر کسی دھات کو سنہرا رنگ دیا جائے اور رنگ پختہ بھی ہو تو اس کے اندر سونے کی مانند وزن بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

قدیم حکماء کا نظریہ تھا کہ ہر دو امور ممکن ہیں مگر سائنس دان اس سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور اسے محض جنون سے عبارت سمجھتے ہیں مگر آج کل کے سائنس دان اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ ایک عام دھات کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر اس پر خرچ اس قدر اٹھتا ہے کہ نفع سے نقصان کئی گنا زیادہ ہوتا ہے جابر بن حیان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس فن کے کامیاب ماہروں میں سے تھے گو بعض لوگ اس کے قائل نہیں مگر یہ تو ظاہر ہے جابر بن حیان نے مختلف اقسام کے تیزاب بنا کر اس فن میں ایک انقلاب پیدا کیا اور معاویہ یا خالد بن یزید کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اس فن کی مصروفیت کی وجہ سے خلافت ترک کر دی تھی۔

بہرحال ہمیشہ سے اس فن کے شائق موجود رہے ہیں اور سینکڑوں افراد نے مختلف دھاتوں کو سونے میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے لہٰذا یہ عقل کے خلاف ہے کہ تمام مشاہدہ کرنے والوں کو دھوکہ ہوا ہو اور یا انہوں نے جھوٹ بولا ہو۔ ان مشاہدوں میں بڑے بڑے اولیاء کے نام بھی موجود ہیں خود میرے مرشد نہ صرف اس کے قائل تھے بلکہ حامل بھی تھے گو ان کا خیال تھا کہ سالک راہ حق کے لئے سونا بنانا شرک سے کم نہیں نیز 80 برس سے زیادہ اس کا رنگ اور وزن برقرار

نہیں رہ سکتا میں نے موسیٰ جار اللہ صاحب سے بھی اس فن کے متعلق پوچھا تھا فرمایا "ہاں چند نسخے جانتا ہوں مگر شرک عظیم ہے خصوصاً" تمہارے لئے میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

مجھے اس فن کا شوق ایک پیر بھائی کو یہ کام کرتے دیکھ کر ہوا تھا پہلے پہل مجھے بھی یہ ایک فضول کام معلوم ہوا مگر آہستہ آہستہ طبیعت اس طرف مائل ہونے لگی اور میں بھی اس شغل میں مصروف ہوگیا چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میں قلمی شورہ کو ہلدی کی چھکیاں دے کر قائم کرتا تھا قائم ہونے کے بعد وہ آگ پر شعلہ نہیں دیتا تھا اور اس میں ہڑتال اور سنکھیا رکھ کر قائم کرتا تھا مگر وہ ہردو کی طرح کرنے سے نہ سونا بنتا تھا نہ چاندی۔ چنانچہ ایک دن میں نے یہی قلمی شورہ بنایا سوئے اتفاق سے وہ کچھ کچا رہ گیا تھا پھر گندھک اور پارے کو شیر مدار سے کھرل کرکے دو قہوے کی پیالیوں میں اس قلمی شورہ کے درمیان رکھا اور پیالوں کی خوب گل حکمت کرکے تنور میں رکھا۔ چونکہ میں ناتجربہ کار تھا اس لئے یہ نہ سوچا کہ نم دار اور گیلی دوا کو اس طرح بند کرنا کہ اس کے بخارات خارج نہ ہوسکیں خطرناک ہوتا ہے مزید برآں قلمی شورہ بھی کچا ہی رہ گیا تھا اور اب یہ دو پیالے ایک خطرناک بم بن گئے تھے چنانچہ تنور کا ڈھکنا اٹھا کر اندر پیالوں کو اپلوں کے درمیان رکھ کر آگ لگا دی آدھ گھنٹہ کے بعد میں باہر جانے لگا تو تنور کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا اور اپلوں کا شعلہ ختم ہوچکا تھا میں نے اطمینان کی سانس لی اور حجرے چلا گیا مگر میں ابھی حجرے میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک زبردست دھماکہ ہوا مجھے یہ گمان تک نہ تھا کہ دھماکہ تنور میں ہوا ہے ہمارے ایک بوڑھے چچا بندوق لے کر گھر سے نکل آئے وہ بندوق بھرے جاتے اور پکارتے جاتے۔ دوڑو کسی نے بم پھینک دیا ہے اتنے میں ایک چھوٹے بچے نے آکر کہا "تمہاری دوائی نے ڈز کردیا۔" یہ سنتے ہی بڑے بھائی نے مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور میں منفعل ہو کر گھر چلا گیا تنور کو زیادہ نقصان نہ پہنچا تھا البتہ اس کا ڈھکنا غائب تھا گویا ریزہ ریزہ ہوگیا تھا۔

اور اب اپنا مشاہدہ پیش کرتا ہوں اردو ادب کی دنیا جناب سید مظہر گیلانی مرحوم کی شخصیت سے بخوبی واقف ہے ان کے ایک بڑے بھائی تھے بہت بڑے عالم اور حکیم بھی تھے آپ فن کیمیا کے دلدادہ تھے میرے دو دوست حکیم فقیر محمد مرحوم اور عبدالقیوم مرحوم ان کے پاس بیٹھا کرتے تھے جو اس فن کے شائق تھے اور تینوں مل کر نسخے بھی بناتے تھے میں ان دنوں پشاور سے تین میل اور موضع پچکی کے پاس "دہ فقیر" نامی قصبے میں رہتا تھا وہاں میرے ایک بہنوئی حاجی شاز خان شنواری کی زمین ہے اور رہائش کے لئے ایک چھوٹی سی گڑھی بنائی ہے چنانچہ موسم سرما میں وہاں گزارتا ہوں میں نے اکثر و بیشتر غزلیں موضع پچکی کے ارد گرد مزارات شہید بابا اور فقیر بابا میں لکھیں شہر آتا تو کچہری دروازے کے پاس ہی بگھی کا اڈہ تھا وہاں تانگے سے اتر جاتا اڈے کے پاس ہی جناب گیلانی صاحب کا مکان تھا انہیں ضرور ملتا چنانچہ گیلانی صاحب نے لوہے اور تانبے کا ایک نسخہ شروع کیا تھا۔ حکیم فقیر محمد اور عبدالقیوم اس میں لگے رہتے اور گیلانی صاحب اخبار کا مطالعہ کرتے اور یا حقہ گڑگڑاتے ایک دن عبدالقیوم کو دو تولہ چاندی کا ٹکڑا دے کر فرمایا ذرا اس دوا کا ایک ماشہ تو اس پر طرح کرکے دیکھو۔ چنانچہ طرح کرنے کے بعد چاندی سیاہ ہوگئی۔ شاہ صاحب نے فرمایا "کچھ بھی نہیں چاندی کو شورے کے تیزاب میں ڈالو، تاکہ صاف ہوجائے" عبدالقیوم نے ڈلی کی ڈلی ہی شورے کے تیزاب میں ڈال دی اور آگ پر رکھ دی آخر آدھ گھنٹہ یا اس سے کم و بیش وقت میں ایک ٹکڑا باقی رہ گیا جس پر تیزاب کا اثر نہیں ہوا عبدالقیوم نے پانی ڈال کر انگلیوں سے صاف کیا تو اندر سے سنہرا رنگ نکل آیا کہنے لگا "لو آغا جی ' یہ سونا" آغا جی یعنی گیلانی صاحب حقہ گڑگڑاتے ہوئے لاپروائی سے کہنے لگے ' ہاں اندر شہر میں بہت ہے۔ عبدالقیوم نے کہا آغا جی میں مذاق نہیں کررہا آپ دیکھ تو لیجئے۔ انہوں نے دیکھا تو پانسے کا سونا تھا۔ حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تول کر وزن کیا تو پورا دس ماشے تھا اسی وقت بازار اندر شہر (صرافہ بازار) بھیج دیا

اور تھوڑی دیر میں روپے آگئے۔ آغا جی نے حکم دیا فقراء میں بانٹ دیئے جائیں۔
چونکہ یہ نسخہ تقریباً" میرے سامنے بنا تھا گو اس کا تمام تر طریقہ معلوم نہ تھا مگر دس پندرہ برس کے بعد جب ایک دن میں نے اس کا ذکر کیا تو اس پیر بھائی نے درخواست کی کہ میں اسے یہ نسخہ بتا دوں جس کے ساتھ مل کر یہ لت پڑ گئی تھی کیونکہ میں بعد میں زیادہ تر کتابیں ڈرامے اور نظمیں لکھ کر وقت گزارا کرتا تھا لیکن اس فن کا شوق بھی برقرار تھا چنانچہ میں نے دو تین دوستوں کی موجودگی میں اسے وہ نسخہ سنایا کہ اسے پچیس آگ دی جاتی ہے وہ بارہ تیرہ آگ دے کر لے آیا اور ایک ماشہ کے قریب تمام چاندی پر میری موجودگی میں طرح دی گئی چاندی کسی قدر سیاہ ہوگئی پھر شورے کے تیزاب میں ڈال دی گئی اور جب تمام چاندی حل ہوگئی تو نیچے نسوار کی مانند ایک سفوف تہ نشین ہوگیا۔ اسے چرخ دیا گیا تو صرف پانچ رتی پاسے کا سونا برآمد ہوا ایک دوست کو شک ہوا اس نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ یہ سونا اس چاندی میں پہلے موجود تھا مجھے یہ اکسیر دے دو میں گھر میں طرح کر کے دیکھوں گا چنانچہ اسے تھوڑی سی وہ سیاہ دوا دے دی گئی اور وہ گھر چلا گیا دوسرے دن آکر اس نے بتایا کہ دوا صحیح ہے میں نے گھر میں دوسری چاندی کے ٹکڑے پر طرح دی تو شورے کے تیزاب میں اسی طرح نسواری سفوف تہ نشین ہوا اور چرخ دینے کے بعد وہ سونا نکلا۔

بمبئی میں دوبارہ آمد

رفیق غزنوی مرحوم کی طرف سے پشتو فلم "لیلیٰ مجنوں" کے گانے اور مکالمے لکھنے کی دعوت 1941ء کے آخر میں ملی چنانچہ میں عبدالکریم عندلیب مرحوم کی معیت میں بمبئی روانہ ہوا جو ایک اچھے گویئے تھے شاعر بھی تھے اور پختونوں کے درانی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اس کا بیٹا مصطفیٰ درانی (جی ایم درانی) اب تک بھارت میں ہے جو میوزک ڈائریکٹر اور اچھا نغمہ نواز ہے (جی ایم درانی اس خود نوشت کے لکھنے کے کچھ عرصے بعد فوت ہوگئے) چونکہ ہم ایکسپریس سے روانہ ہوئے تھے اس لئے ریل میں چار دن کا سفر درپیش تھا گویا ان دنوں مسافروں کا نہ اس قدر اژدحام تھا جیسے آج کل ہے اور نہ آبادی اس قدر بڑھ چکی تھی تاہم جگہ بہ جگہ مسافروں کا ہجوم ہو ہی جاتا ہم تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے اور ہم نے نچلی سیٹ پر بستر بھی بچھا دیئے تھے غالباً" بھوپال سٹیشن پر زیادہ مسافر چڑھ آئے جو اکثر و بیشتر ہندو تھے میں تمام راستے مسافروں کو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پاس ہی بستر پر جگہ دیا کرتا تھا بھوپال پر جو مسافر ہمارے ڈبے میں آگئے ان میں ایک بے حد ضعیف اور بیمار ہندو بھی تھے جو دو آدمیوں کا سہارا لئے اندر داخل ہوا اور جگہ نہ ملنے کے باعث کھڑا کانپتا رہا میں نے فوراً" اپنی جگہ اسے دے دی اور آرام سے اپنے بستر پر لٹا دیا ویسے بھی تمام راستے میری رواداری کی وجہ سے ہمراہی میرا احترام کرنے لگے تھے اور ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں "بڑا دھرماتما ہے" اور جب ہم بمبئی پہنچے تو میں نے محسوس کیا کہ رواداری اور انسانی ہمدردی کتنا عظیم و شریف وصف ہے چنانچہ ہم ماہم کے مقام پر رفیق غزنوی کے گھر پہنچ گئے جو سمندر کے بہت ہی قریب تھے چونکہ میں زیادہ تر مکان میں ہی رہا کرتا اس لئے شام کے وقت سمندر کے کنارے دو چار میل تک چہل قدمی کیا کرتا اور پھر شام کے کھانے کے بعد جناب مخدوم صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے چلا جاتا

جہاں ایک ڈاکٹر جی ایم سید صاحب کا مطب تھا وہ پشتونوں سے بہت محبت کرتے تھے اور جیسے کہ انہوں نے کہا تھا وہ قائد اعظم کے دوستوں میں سے تھے ان کی ایک سوسائٹی تھی جس میں ادیب و شاعر اور اہل علم حصہ لیا کرتے تھے ہر رات وہاں ایک علمی اجتماع ہوا کرتا تھا مشہور نغمہ نگار تنویر نقوی مرحوم اور ان کے بڑے بھائی وہاں موجود ہوتے - تنویر نقوی کی مجھ سے بے حد محبت تھی اور اکثر میرے تخیلات کو اردو میں ترجمہ کیا کرتے تھے - رفیق غزنوی کی لڑکی سے پشاور کے مشہور ادیب اور فلم ڈائریکٹر جناب ضیاء سرحدی نے شادی کی تھی اسی طرح کئی ایک لکھنے والے رفیق غزنوی کے دوست تھے اور چونکہ رفیق غزنوی ملحد تھے اس لئے کبھی کبھی ہمارے درمیان نوک جھونک ہوا کرتی تھی اور آخر اس نوک جھونک نے مستقل مناظرے کی صورت اختیار کرلی چنانچہ ہوتے ہوتے رفیق مرحوم کا موقف کمزور ہوتا گیا اور ان کے شاگرد میرا دم بھرنے لگے رفیق کبھی کبھی کہہ دیتے کہ آپ نے میرے مکان کو نمازوں کی کثرت سے مسجد بنا دیا ہے اور ایک دن جبکہ وہ اپنی لڑکی سے پشتو میں بات چیت کررہا تھا میں اور ضیاء سرحدی اندر آگئے وہ اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا کہ ضیاء بے کار ہوگیا - خدا جانے وہ حمزہ کو خدا سمجھنے لگا ہے کہ پیغمبر اس کے ساتھ نمازیں پڑھنے لگا ہے ضیاء نے باہر سے جواب دیا بابو جی بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نماز پڑھنے پر مجھے پیکار فرما رہے ہیں میں نے اونچی آواز سے کہا کہ ہم سن رہے ہیں آہستہ سے کہا ارے یہ بھی ساتھ آگئے ہیں-

ایک دن شوٹنگ کے موقع پر ذکریا خان عرف جینت میری ملاقات کو آیا تب وہ بالکل بچہ سا تھا ہم پشاور میں ان کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے اسے فلمی دنیا کا شوق تھا اور مجھے بھی - میں اسے ایکٹنگ سکھایا کرتا اور اس کے سامنے آئینہ رکھ کر اداکاری کرنے کی ہدایت کرتا - آتے ہی لپٹ پڑا ' علیک سلیک کے بعد کہنے لگا - یار یہ چادر تو اتار دو - واضح ہو کہ میں ہمیشہ چادر اوڑھے رہتا - جواب دیا ' کیوں - کہنے لگا یہ آدمی ہنستے ہیں میں نے کہا کہ مجھے تو یہاں کوئی آدمی نظر نہیں آتا

جینت نے ارد گرد اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب آدمی نہیں ہیں میں نے کہا کہ واہ تو کیا آپ ان ایکٹروں اور ڈائریکٹروں کو بھی آدمی سمجھتے ہیں میرے نزدیک تو یہ تمام حیوان ہیں۔

انہی دنوں پنجاب کے رہنے والے ایک پروفیسر واقف صاحب کے مکان پر اردو کا ایک مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا طرح کا مصرعہ پہلے سے مشتہر ہو چکا تھا -

ہم انقلاب شام و سحر دیکھتے رہے

میں نے بھی اس پر غزل لکھی اور مقررہ شب کو پروفیسر واقف کے مکان کی طرف روانہ ہوا ساتھ دو پختون سازندے بھی تھے ایک سارنگی کا استاد گل میر مرحوم تھا کہنے لگا ' خدا جانے آپ نے کیسی غزل لکھی ہو میں نے کہا کہ اس مشاعرے میں نہ جوش ہے نہ جگر اور ان فلمی شاعروں سے میں بہرحال اچھا لکھ سکتا ہوں تم فکر نہ کرو چنانچہ جب میں اس مکان کی اوپر کی منزل میں پہنچا تو وہاں شاطر غزنوی پر نظر پڑی ویسے میرے کاندھے پر چادر دیکھتے ہی حاضرین متعجب ہوئے وہاں چادر سے یک گونہ غیریت کا اظہار کیا جاتا تھا شاطر صاحب مجھے دیکھتے ہی میری طرف آئے گلے لگایا اور کہنے لگے - حمزہ صاحب یا تو آپ نے داڑھی بڑھالی ہے اور یا کچھ اور معاملہ ہے - وجہ یہ تھی کہ جب 1935ء میں پشاور کے سیکرٹریٹ میں آل انڈیا ریڈیو کی شاخ کھلی تھی شاطر صاحب وہاں ڈرامے لکھا کرتے تھے اور اب فلم لائن میں آگئے تھے اور ہاں یہ تو میں بھول ہی چکا ہوں کہ شمیم بھیروی بھی وہاں موجود تھے جو اب عرصہ سے مستقل طور پر پشاور میں بس گئے تھے میں نے اس مشاعرے کی اردو غزل انہیں دکھائی تھی مگر انہوں نے یہ کہہ کر اصلاح دینے سے انکار کردیا کہ واہ میں اور آپ کی اصلاح کروں - میں نے کہا کہ بھائی عرصہ سے اردو ترک کرچکا ہوں اور کچھ نہ ہو تو زبان کی غلطی تو ہوسکتی ہے مگر انہوں نے کہا کوئی غلطی نہیں -

شاطر غزنوی مجھے دیوار کے ساتھ والی شعراء کی صف میں لے جاکر بٹھا

گئے پروفیسر واقف صاحب نے استفہام اور تعجب کے ملے جلے تاثرات سے اس کی طرف دیکھا شاطر صاحب نے کہا کہ حمزہ صاحب پشتو شاعری میں اسی صف کے آدمی ہیں اردو کا مجھے علم نہیں لکھتے ہیں یا نہیں میں نے کہا کہ شاطر صاحب میں اردو غزل لکھ کر لایا ہوں۔

وہ صف کہنہ مشق استاد شاعروں کے لئے مختص تھی غرض مشاعرہ شروع ہوا اور جیسا کہ قاعدہ ہے پہلے نوجوان اور مبتدی شعراء کو بلایا گیا اور ایک بجے شب کے بعد استاد شعراء کی باری آگئی چنانچہ تین بجے شب میرا نام پکارا گیا میں نے طرحی غزل کے علاوہ دو رباعیاں بھی لکھ رکھی تھیں رباعیوں کے بعد غزل پڑھی خوب داد دی گئی خصوصاً" استاد شعراء نے آخری دو اشعار بہت پسند کئے چند شعر جو اب تک یاد ہیں یہاں پیش کرتا ہوں۔

ہم ان کے آنسوؤں کے گہر دیکھتے رہے
وہ بھی تو جذب دل کا اثر دیکھتے رہے
دیکھا نہیں، بدیدہ سوزن قسم، انہیں
ہم پردہ ہائے تار نظر دیکھتے رہے
معیار حسن جان گئے ان کو دیکھ کر
کچھ مدعا نہیں تھا مگر دیکھتے رہے
اوروں نے سر کو بار سمجھ کر جدا کیا
ہم سر پھرے تھے زاد سفر دیکھتے رہے
ہم جوہر معانی حیرت میں کھو گئے
آئینہ ساز اپنا ہنر دیکھتے رہے
وہ ناپدید ہوگئے کثرت سے دید کی
کیا ہم نظامی راہ گزر دیکھتے رہے

میں اردو میں ہمیشہ نظامی تخلص کرتا آیا ہوں گو طالب علمی کے زمانے میں

حمزہ ہی تخلص کرتا تھا اور اتفاق ملاحظہ ہوں کہ جب میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس کے موقع پر سرکاری طور پر بلایا گیا تھا کیونکہ وہاں سابق صدر ایوب مرحوم لطیف اکیڈمی کی رسم افتتاح بھٹ شاہ کے مقام پر ادا کرنے والے تھے تو محکمہ اطلاعات کی طرف سے حیدر آباد میں ایک پشتو اور سندھی بلکہ تمام پاکستانی علاقائی زبانوں کا مشاعرہ منعقد ہوا غزلوں کا ترجمہ لکھ لیا گیا تھا وہی سنایا گیا لیکن ابھی میں نے ختم ہی کیا تھا کہ مجھے سے آواز آئی، حمزہ صاحب۔ وہ بمبئی والی غزل پڑھیئے میں نے متعجب ہو کر کہا جناب آپ بھی وہاں تشریف رکھتے تھے فرمایا ہاں میں موجود تھا چنانچہ چند شعر سنائے اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ یہ اشعار 1941ء کے ہیں جو اردو کے موجودہ معیار کے مطابق نہیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور خوشحال خان بابا نے بھی فرمایا ہے۔

کہ خو وائے د خوشحال ترخنگہ کبی
وا د غرہ خٹک بہ وارہ شاعران شی

"یعنی اگرچہ چند دن خوشحال کی صحبت اختیار کریں تو پہاڑوں کے رہنے والے خٹک تمام شاعر ہو جائیں گے" چنانچہ یہی واقعہ میرے ساتھ ہوا، خیبر کے اکثر نوجوان شاعری کا شوق کرنے لگے اور ان میں سے پہلا شاعر جو مجھ سے متعارف ہوا وہ محمد اکرم خان فاروق شنواری تھا وہ مجھ سے ملنے سے پہلے چار بیتے اور دوسرے گیت لکھا کرتا تھا ایک علمی خاندان کا فرد تھا فارسی اور فقہ کی چند کتب پڑھ چکا تھا اردو بھی لکھ پڑھ لیتا تھا علمی استعداد کافی اچھی تھی سرائے لنڈی کوتل میں دکان کرتا تھا مجھ سے مشورہ کرنے لگا اور پھر نہایت خوبصورت غزلیں لکھنے لگا بعد میں بہترین نثر لکھنے لگا۔ ریڈیو کے لئے پشتو میں ڈرامے بھی لکھے میرے اکثر خطوط جمع کرتا رہا اور انہیں ایک علیحدہ بیاض میں لکھتا رہتا اور بعد میں مختلف کاروباری کاموں

میں ہزاروں روپے کمائے وہ اتنا شاہ خرچ تھا کہ کچھ پس انداز نہ کرسکا سخاوت گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی اور پھر یکایک اس نے شاعری کو خیرباد کہا وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگا کہ خوشحال خان بابا کے قول کے مطابق فلاکت شاعری کے لوازم میں سے ہے گو وہ آخر تک سرمایہ دار نہ بن سکا مگر گزر اوقات آخر تک اچھی رہی ہے میری کتاب "غزوونے" جو نظموں غزلوں اور قطعات و رباعیات کا مجموعہ ہے اور آنرز ان پشتو اور ایم اے پشتو کے کورس میں شامل ہے اس پر فاروق نے جو مقدمہ لکھا ہے پشتو کی بہترین نثر کا نمونہ ہے فاروق کے بعد بہت سے نوجوان مثلاً "لعل زادہ ناظر (جو میرا بھانجا ہے) حکم شاہ باصر مرحوم' اختر محمد اختر میرا بھتیجا شہزاد خان جوہر میرا چھوٹا بھائی محمد عمر سیماب اور بکثرت نوجوان شاعری کرنے لگے چنانچہ میں نے لنڈی کوتل میں سب سے پہلے پشتو مشاعرے کا انتظام جولائی 1940ء میں کیا ایک مزاحیہ مصرعہ طرح پر مشاعرہ ہوا تاکہ سننے والے محظوظ ہوں اور آئندہ کے مشاعروں میں شوق سے شامل ہوں اس کی صدارت محمد طاؤس خان ہمدرد شنواری مرحوم نے کی۔ جو بعد میں سی آئی اے رہے۔ اچھے شاعر تھے میری کتاب "غزوونے" (انگڑائیاں) پر انہوں نے ایک مختصر مقدمہ تحریر کیا تھا جو آج تک موجود ہے ان کی یاد میں ہماری طرف سے ایک مشاعرہ منعقد ہوا اور اسی طرح ہمارے جن شاعر دوستوں نے وفات پائی ان کی یاد میں مشاعرے منعقد ہوتے رہے صابر' باصر اور اختر مرحوم کی یاد میں مشاعرے منعقد ہوئے۔ ایک مشاعرہ میرے مرحوم بھائی یار محمد خان کی یاد میں منعقد ہوا جو کابل میں انتقال کرگئے جس کا ذکر ہوچکا ہے اور پھر ہر سال گرمیوں کے موسم میں میرے گاؤں میں مشاعرے منعقد ہوتے رہے۔ خاطر آفریدی مرحوم کی یاد میں بھی مشاعرہ منعقد کیا گیا میرے بھانجے ناظر نے بے حد ترقی کی اگرچہ ان کی تعلیم صفر کے برابر تھی مگر تخیل بلا کا پایا تھا اس کا ذہن فطری فلسفہ اور منطق کا وافر ذخیرہ لئے ہوئے تھے چنانچہ اب خیبر کے تمام نوجوان شعراء اس سے اصلاح لیتے تھے۔ خاطر آفریدی مرحوم کو ناظر کی

اصلاح نے خوب چمکایا چنانچہ اس کی غزلیں آج تک لوگوں سے خراج تحسین وصول کررہی ہیں۔

1940-41ء میں غم روزگار کی اس قدر شدت نہیں تھی چنانچہ ہم لنڈی کوتل سے تین میل دور لنڈی خانہ اور تورخم کے پاس چار باغ میں پکنک کے لئے جاتے اور وہاں مشاعرے منعقد کرتے ہمارا قاعدہ تھا کہ مشاعرہ طرحی ہو یا غیر طرحی اس کے افتتاح کے بعد فی البدیہہ مشاعرہ منعقد کرتے اور وہ مزاحیہ ہوا کرتا۔ ایک طرح مصرعہ دے دیا جاتا اور زیادہ سے زیادہ دس منٹ کا وقت دے دیا جاتا اور پھر مشاعرہ شروع ہوجاتا جس نے جتنے بھی شعر لکھے ہوتے وہ پڑھ لیتا چنانچہ اس طرح سے ان کے شاعرانہ ذہنوں میں خوب بیداری پیدا ہوتی گئی اور ایک دفعہ لکہ پہاڑ پر پکنک کے موقع پر میں نے رباب ہاتھ میں لیا اور ساتھ ہی ایک مصرعہ پڑھا اور نوجوان کو ہدایت کی کہ پہلے میں خود رباب کے ساتھ اس مصرعہ پر مطلع کہوں گا اور ترنم سے اس کے بعد تمام باری باری سے ترنم کے ساتھ اس پر ایک ایک شعر سنائیں گے۔ خبردار کوئی ناکام نہ ہونے پائے اور ساتھ ہی گھڑا بھی بجایا جانے لگا۔ چنانچہ دس اشعار کی ایک غزل فی البدیہہ تیار ہوگئی اور کوئی بھی اپنی باری پر فی البدیہہ شعر سنانے میں ناکام نہ ہوا اور اب تو "خیبر کی غزل" ضرب المثل ہوچکی ہے اور کثرت سے لکھنے والے سامنے آئے ہیں۔

1942ء میں میری دوسری بیوی کا انتقال ہوگیا اور چونکہ وہ پانچ سال سے بیمار رہی اس لئے اس وقت مجھے فوری طور پر شدید غم کا احساس نہ ہوسکا میں نے اس کا بہتیرا علاج کرایا' دہلی اور اجمیر لے گیا مگر جانبر نہ ہوسکی محبت کی شادی کا انجام آگیا جس دن اس کا انتقال ہونا تھا مجھے اندر بلایا کہنے لگی' "آج دنیا میں میرا آخری دن ہے اس لئے میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے بخش دیں اور میرے لئے دعا کریں۔" میں نے کہا کہ یہ تیرا وہم ہے ابھی تو نے کہاں مرنا ہے۔ کہا کہ آپ نے نہ صرف دعا و دوا سے میری صحت کی بحالی کے لئے کوشش کی بلکہ

امید افزا باتوں سے بھی میری حوصلہ افزائی کی اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا و آخرت میں خوش و خرم رکھے، گزشتہ رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا خواب دیکھا ہے۔ کہنے لگی، "میں نے دیکھا کہ میں یہاں ہی چارپائی پر پڑی ہوں کہ فضا میں دو عورتیں اڑتی ہوئی نظر آئیں اور جب وہ اس گھر کے صحن کے اوپر پہنچ گئیں تو سامنے چھت پر اتر گئیں ان میں سے ایک بی بی اور دوسری خادمہ تھی خادمہ نے بی بی سے عرض کیا کہ بی بی یہ بیمار عورت بڑی اچھی عورت ہے اس کے لئے دعا فرمایئے۔ بی بی نے کہا کہ میری دعا ہے اگر آپ اچھی بھی ہو گئیں تو آخر مرنا ہی ہے اس لئے میں دعا کرتی ہوں کہ اسے اللہ تعالیٰ جنت الفردوس نصیب کرے اور یہ کہتے ہی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور پھر فضا میں اڑنے لگیں میں نے اس کی خادمہ کو آواز دی کہ "برائے خدا یہ تو بتا دو کہ یہ بی بی صاحبہ کون تھیں کہنے لگی خاتون جنت حضرت فاطمہ الزہرا ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ میرا آخری دن ہے" اور پھر اپنی والدہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ماں ان چوزوں کو خوب حفاظت سے رکھو کیونکہ ان (میری طرف اشارہ کر کے) کے ساتھ سمندر صاحب آیا کرتے ہیں اور پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی "میں آپ کو آخری وصیت یہ کرتی ہوں کہ میرے بعد فوراً" ہی شادی کر لیں اور ہرگز ہرگز مجرو نہ رہیں" اور پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگی "الٰہی، ان کو مجھ سے بہتر بی بی عطا فرما"

مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا باہر جا کر حجرے میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا اور پھر پشاور جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میں اپنے سامنے اسے مرتے نہ دیکھ سکتا تھا چنانچہ فوراً" اٹھ کھڑا ہوا اور گاؤں کے دروازے سے باہر نکلا۔ واضح ہو کہ یہ میری بیوی عرصہ سے اپنے والد کے ہاں پڑی تھی اور میں بھی ساتھ ہی رہتا تھا۔ چنانچہ میں سرائے کی طرف روانہ ہوا مگر ابھی چند ہی قدم گیا تھا کہ میری بیوی کا بڑا بھائی جو میری بیوی سے چھوٹا اور دوسرے بھائی فضل حق سے بڑا تھا دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ بہن نے کہا ہے کہ صرف پانچ منٹ کے لئے آجائیں۔ میں بادل ناخواستہ

واپس ہوا اور جب اس نے مجھے آتے دیکھا تو ایک عجیب تبسم اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوا۔ عالم نزع کی کپکپاہٹ اور ملامت ملی جلی تھی۔ کہنے لگی "مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے اس لئے پشاور جانا چاہتے ہیں لیکن آپ کو حوصلے سے کام لینا چاہئے موت سے کوئی مفر نہیں آخر ایک نہ ایک دن تو سب نے جانا ہی ہے"

چونکہ اسے جگر کی بیماری تھی اور اب آخری درجہ تک پہنچنے کے بعد استسقا کی صورت اختیار کر گئی تھی اس لئے اس کا بچنا محال تھا اس کے والد بھی پاس ہی بیٹھے تھے میں نے کہا "تم فکر مت کرو، میں کہیں نہیں جاؤں گا" اور پھر حجرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اس کا بھائی آیا اور مجھے اندر لے گیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ بات کرنے کی سکت نہیں رکھتی تھی میں نے کہا "اس وقت اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی تیری مدد نہیں کر سکتا، کیا تجھے اللہ تعالیٰ نے یاد کیا ہے" اس نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا، میں نے کہا "پھر تجھے کیا غم۔ جاؤ میں نے تجھے خدا کے سپرد کیا" اور باہر نکل آیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کی والدہ اور بھائیوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

اس کے بعد میں پشاور چلا گیا ایک بالا خانہ کرایہ پر لے کر رہنے لگا اور اب غم کے بادل چھانے لگے کیونکہ جب اس کی موت میرے خیال میں ایک دن یقینی تھی تو میرا ارادہ بھی اس غم کے استقبال کے لئے سخت تر ہو گیا تھا اور اس کی موت کے بعد کسی خاص رد عمل کا اظہار نہ ہو سکا مگر بعد میں جب اس سخت اور قوی ارادہ کی ضرورت نہ رہی تو رنج و غم کے ایک کثیر لشکر کو گویا آزادی مل گئی اور وہ بری طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا جب اس کا زور شدت اختیار کر جاتا تو میں بالا خانے سے باہر آکر کسی طرف غیر شعوری طور پر چل پڑتا اور کئی میل کے چکر لگا کر واپس آتا چنانچہ میری کتاب "غزونے" کی اکثر غزلیں اسی کی یاد میں کہی گئی ہیں۔ 1954ء کے ماہ جولائی میں میرے شیخ حضرت سید عبدالستار شاہ صاحب چشتی نظامی

نیازی کا وصال ہو گیا میں اس وقت لنڈی کوتل میں تھا اطلاع ملی تو جہاں تھا وہیں گم صم ہو کر رہ گیا چنانچہ فوراً پشاور پہنچا ادھر جا کر دیکھا تو حضور جیسے سوئے ہوئے ہیں وہی سرخ سفید چہرہ اذیت جان کنی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے لوگ آکر دیدار کرتے اور حیران ہوتے اور پھر جب جنازہ اٹھا تو حضور کے ڈیرے سے ڈبگری دروازے تک ایک فرلانگ کا راستہ ہجوم کی وجہ سے تقریباً ایک گھنٹے میں طے ہو سکا اور اردگرد کے مکانات اور دکانوں کے برآمدوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور جب میں نے اپنی تکلیف کا احساس کیا تو وہ جا چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ حضور مجھے مسلسل تکالیف میں اس لئے مبتلا رکھتے تھے کہ میں کہیں دوسرے پیر کے پاس نہ جاؤں اور انہیں ہی کے پاس رہتے ہوئے ان کے گن گاؤں مگر اب اور اس کے بعد متواتر احساس ہوا کہ جیسے کہ حضور فرمایا کرتے تھے ان تکالیف سے تجھے فائدہ ہو گا صحیح فرماتے۔ کیونکہ ان تکالیف کے بعد عجیب سا سکون و اطمینان محسوس ہوا اور ساتھ ہی ساتھ عجیب و غریب علوم و اسرار کا انکشاف ہونے لگا۔

1969ء میں سفر حج پر روانہ ہوا ہم ایک بس میں صرف بائیس آدمی تھے جن میں سے چار بس کے ڈرائیور تھے اور کلینر تھے اور اٹھارہ ہم شنواری اور آفریدی اور مومند تھے اور ہمارا قافلہ سالار حاجی محمد خان شنواری تھا جو بے حد دلیر اور منتظم انسان ہے مجھے اگلی سیٹ دے دی گئی تھی۔ تین سواریوں والی سیٹ پر دو اور دو سواریوں والی سیٹ پر ایک آدمی کو جگہ دے دی گئی تھی چنانچہ ہم 29 جنوری 1969ء کو کابل سے روانہ ہوئے حاجی محمد خان نے جو میرے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا کہا "حمزہ صاحب آپ نے توج کے متعلق ایک شعر بھی کہا تھا" میں نے کہا "مجھے یاد نہیں آرہا" کہنے لگا

حمزہ سفر کہ د حجاز دی نو ہم
زہ د پختون د قافلو سرہ خم

(یعنی اے حمزہ، حجاز کا ہی سفر کیوں نہ ہو لیکن میں جاؤں گا تو صرف پختونوں کے

ہمراہ۔ میں نے کہا "تمہارا حافظہ تو بہت اچھا ہے"

کابل سے لے کر عراق کی سرحد تک بے پناہ برف پڑی تھی لیکن خدا کے فضل و کرم سے ہماری بس میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی ہم 2 فروری 1969ء کو مکہ معظمہ بخیریت پہنچ گئے، چنانچہ اس تمام سفر کی روئیداد میرے سفرنامے "د حجاز پہ لور" (سوئے حجاز) میں موجود ہے۔ سفرنامہ چھپ چکا ہے۔

اگرچہ مجھے اختصار منظور تھا مگر لکھتے لکھتے معاملہ طول پکڑتا رہا اور اگر یوں ہی لکھتا رہا تو پھر اس کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی لہٰذا میں اس پر اکتفا کرتا ہوں۔

سوال 2:- قبائلی علاقے میں رہنے کے باوجود اس زمانے کے لحاظ سے
جو قدیم و جدید تعلیم آپ نے حاصل کی اور علوم متداولہ میں استعداد پیدا
کی کیسے ممکن ہو سکی؟

جواب:- میرے خاندان میں ابتداء ہی سے تعلیم کا شوق موجود رہا ہے' میرے
بڑے بھائی بھی تعلیم یافتہ تھے' گو میرے والد صاحب نے صرف قرآن حکیم ہی پڑھا
تھا مگر وہ علم کی افادیت و اہمیت سے بخوبی واقف تھے اس لئے انہوں نے اپنے تمام
لڑکوں کو زیور تعلیم سے آراستہ ہونے میں مدد دی' میرے بڑے بھائیوں کے لئے
پرائیویٹ ٹیوٹر کا انتظام بھی کیا گیا تھا - لیکن اس کے باوجود بھی آج کل کی طرح
تعلیمی معیار وسیع نہیں تھا اور مکتب کی تعلیم کا مدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ طالب علم
ضرور اس قدر استعداد بہم پہنچائے کہ ہر نوع کے علوم و فنون کا مطالعہ بخوبی کر سکے
' کیونکہ علم حقیقت میں صرف مسلسل مطالعہ ہی سے حاصل ہوا کرتا ہے سکولوں
کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل عالم نہیں ہوتے بلکہ عالم بننے کے لئے
تیار ہو جاتے ہیں اور یہی معاملہ میرا بھی ہے کیونکہ میں نے صرف ففتھ ہائی تک
پڑھا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات ہی ناکافی ہے مگر فطری طور پر مجھے مطالعے کا شوق
تھا اور صرف اردو زبان کی کتابوں کا مطالعہ کر سکتا تھا کیونکہ انگریزی واجبی طور پر
سمجھتا تھا کیونکہ ہمارے زمانہ تعلیم میں انگریزی کا مضمون پانچویں جماعت سے شروع
ہوتا تھا البتہ اردو سے مجھے ایک گونہ عشق تھا اور میں مسلسل مطالعہ کرنے لگا
کیونکہ انگریزی واجبی طور پر سمجھتا تھا کیونکہ ہمارے زمانہ تعلیم میں انگریزی کا
مضمون پانچویں جماعت سے پڑھایا جاتا تھا البتہ اردو سے مجھے یک گونہ عشق تھا
اور میں مسلسل مطالعہ کرنے لگا' ابتداء میں مشکل الفاظ و اصطلاحات کے معنی سے
نابلد محض تھا مگر جوں جوں مطالعہ وسیع ہوتا گیا - خود بخود علمی استعداد بھی ترقی کرتی
رہی اور چونکہ اردو میں اکثر و بیشتر مغربی علوم کے تراجم ہو چکے تھے اس لئے میں
علم و فن کی کتابیں مطالعہ کرنے لگا اور تصوف سے چونکہ فطری لگاؤ تھا اس

اس ضمن میں ہر نوع کی مذہبی کتب زیر مطالعہ آنے لگیں میں نے چونکہ ابتداء ہی
میں فارسی کے بجائے عربی کا اختیاری مضمون لیا تھا اس لئے کچھ نہ کچھ عربی کی مذہبی
شد بد بھی حاصل تھی اور فلسفیانہ مضامین نہایت شوق سے پڑھا کرتا تھا وجہ یہی
معلوم ہوتی ہے کہ اس مضمون سے فطری لگاؤ تھا فلسفہ اور تصوف آپس میں بہت
قریب ہیں اور اگر ذات باری کا تصور حاصل ہو تو فلسفہ عین تصوف بن جاتا ہے
کیونکہ فلسفہ بنیادی طور پر کائنات کی تخلیق اور ذات باری کے علت العلل ہونے یا
نہ ہونے کی تحریک پیش کرتا ہے اور یہی تحریک تصوف میں موجود ہے اور جیسے کہ
کلمہ توحید میں نفی و اثبات دونوں موجود ہیں اس لئے سالک تصوف و سلوک میں
آکر سب سے پہلے حصہ نفی کے صحراؤں کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ
تصوف ایک سالک کے تمام وہ ذہنی اور نفسیاتی نقوش کو مٹانا چاہتا ہے جو اپنے
خاندان' ماحول اور معاشرہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ثبت ہو چکے ہوتے ہیں اور
جب سالک کا برزخ بالکل صاف ہو جاتا ہے تو اس کے مرشدان سلسلہ اس کے
برزخ یا آئینہ ذہن پر اپنے نقوش رنگا رنگ ثبت کرنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ نفی
کی اس منزل میں تمام وہ خواہشات بھی ضابطہ میں آجاتی ہے جو حق اور عبد کے
مابین حجاب ہوا کرتی ہیں اور اس ضمن میں بعض ان سالکان راہ طریقت پر الحاد کا
دورہ بھی پڑ جاتا ہے جو ذہنی اور فطری طور پر فلسفہ کی طرف رجحان رکھتے ہوں
چنانچہ میں پانچ سال تک الحاد کا شکار رہا اور اس دوران ذات باری کی نفی میں
ایسے ایسے استدلال وضع کرتا رہا ہے جو اکثر لاجواب ہوا کرتے لیکن جیسا کہ میں
اپنی سوانح میں عرض کر چکا ہوں خواجہ حسن نظامی کی ایک ہی ملاقات میں الحاد کی
بنیاد متزلزل ہو گئی مگر کبھی کبھار اس کی ہوا آجاتی مگر نہایت کمزور اور وہ زائل
ہو جاتی چنانچہ 1975ء میں بھی یہ ہوا کبھی کبھی آجاتی ہے مگر میں اس کا راز سمجھ گیا
ہوں اور اسے آپ کے لئے یہاں لکھنا مفید سمجھتا ہوں جیسے کہ عرض کیا گیا سالک کا
ایک برزخ بنتا ہے برزخ کیا ہے انسانی روح ہی سے عبارت ہے اور جوں جوں

سالک مادی خواہشات کو ضابطہ میں لاتا ہے توں توں اس کی روح سے مادیت کا میل چھنتا جاتا ہے اس روحانی یا روح کے تجلیہ کا نام برزخ ہے برزخ اس پردے کو کہا جاتا ہے جو جانبین کے حالات ایک دوسرے کی طرف منتقل کرتا ہو۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ برزخ ہر دو جانبین کا امتزاج لئے ہوئے ہو ورنہ پھر وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ ایک دوسرے کا پرتو منتقل کر سکے۔ چنانچہ روح انسانی عالم ارواح سے متعلق ہونے کی وجہ سے جسمانیت و مادیت کی آلائش سے قطعاً" پاک ہے مگر جب اسے بدن سے متعلق کیا گیا تو آلائش مادیت کی وجہ سے اس کے اندر نفسیاتی امتزاج پیدا ہوا اور اسے نفس ناطقہ سے موسوم کیا گیا علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبات جدید الٰہیات اسلامیہ میں بھی اس خیال کی تائید کی ہے اور تحریر فرمایا کہ "ابتداء میں مادی کا نفسی پر غلبہ ہوتا ہے مگر جوں جوں انسان مجاہدہ کرتا ہے نفسی کی قوت بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ آخر میں مادی پر غالب آجاتی ہے لیکن اس غلبہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مادیت اور اس کی تحریک بالکل فنا ہو جاتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ نفسی یا روح کے ضابطہ میں آجاتی ہے پہلے ہی مادی خواہشات حاکم اور مطاع ہوتی ہیں اور آخر میں محکوم اور مطیع بن جاتی ہے اور یہی منشا ہے تصوف کا۔ کیونکہ تصوف کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی بنیادی شخصیت یعنی انسانیت حیوانیت پر غالب آجائے کیونکہ حق تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ جو نامزد کیا ہے تو اس کا منشاء یہی ہے کہ وہ کائنات میں ایسا نظام نافذ کرے جس کے تحت حیوانیت کو سر اٹھانے کا موقع نہ دے تاکہ تمام اشیاء اپنی انفرادیت اور فطرت کے مطابق ترقی کر سکیں اور یہی وجہ تھی کہ یورپ اور ایشیاء کے لوگوں نے ڈارون کی تھیوری کو مسترد کر دیا چنانچہ اگر اقوام عالم ڈارون تھیوری کو عملی لباس پہنائیں تو تصور کیجئے دنیا اور اہل دنیا کا اب کیا حال ہوتا، کمزور طاقت وروں کے زیر استحصال ہوتے بڑی مچھلی جیسے چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے یہی حال انسانوں کا ہوتا اور انسان اب تک جو ذہنی مادی اور اخلاقی ترقی کر چکا ہوتا وہ دریا برد ہو کر رہ جاتی یہ عنصر

انسانیت ہی کا احتجاج تھا جو حیوانیت سے مغلوب ہونے کے باوجود کے بھی مسلسل جاری تھا چنانچہ اقوام عالم نے حیوانیت کے غلبہ کے باوجود بھی ڈارون تھیوری کو اپنے قوانین میں جگہ دینے سے انکار کر دیا۔

اب صاف ظاہر ہے کہ جب عنصر انسانیت کو غلبہ ہو گا تو وہ مادیت سے اپنی منشاء کے مطابق کام لے گا' اور چونکہ جوہر عقل صرف انسانیت کا خاصہ ہے اس لئے انسان کا اقتدار عقل کے تحت ہی آگے بڑھے گا لیکن اس کے ساتھ ہی انسانی وجود میں عنصر ملکیت بھی اپنی آب و تاب سے جلوہ گر ہو گا کیونکہ انسانی روح چونکہ عالم ملکیت سے تعلق رکھتی ہے اس لئے حیوانیت کے مغلوب ہوتے ہی وہ آزاد ہو کر انسانیت سے متعلق ہو گی اور ملکیت کا خاصہ ہے عشق۔ عشق باری تعالیٰ اور اب اگر انسانیت ملکیت سے مغلوب ہو گئی تو سکوت عشق سے مجذوب ہو کر تارک الدنیا بن جائے گی جو منشائے الٰہیہ کے خلاف ہے مادیت کا غلبہ ہو گا تو حیوانیت غالب ہو گی اور وہ منشائے خداوندی کے سراسر خلاف ہے منشائے خداوندی یہ ہے کہ غلبہ انسانیت کو ہو اور مادیت و ملکیت اس کے خادم ہوں ورنہ پھر انسان اس قابل ہی نہ رہے گا کہ وہ خلافت الٰہیہ کے فرض کو انجام دے سکے کیونکہ حیوانیت سے صرف شعور ہی پیدا ہوتا ہے جو ڈارون تھیوری سے عبارت ہے اور ملکیت سے عشق پیدا ہوتا ہے جو ترک دنیا کا داعی ہے مگر انسانیت سے عقل پیدا ہوتی ہے جو منشائے خداوندی سے متعلق ہے چنانچہ تصوف کا منشاء یہی ہے کہ انسانیت حاکم اور حیوانیت و ملکیت اس کے خادم اور بطور بدرقہ ساتھ ہوں حیوانیت کا ذریعہ مادیت سے متعلق رہے اور ملکیت کے ذریعے ذات باری سے تعلق رکھے اور دراصل یہی وہ نقطہ اعتدال ہے جس میں زندگی ہے امن ہے اور مسرت ہے۔

میری زندگی کا بیشتر حصہ پشاور شہر اور پاک و ہند کے دوسرے شہروں میں گزرا ہے اس لئے قبائلی ماحول کا زیادہ اثر مجھ پر نہیں پڑ سکا' اس دوران میرے مطالعہ میں ہر نوع کی کتابیں آئیں۔ چونکہ حافظہ بہت اچھا تھا اس لئے جو کچھ پڑھتا

یاد ہو جاتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ علم کا احاطہ حافظہ ہی سے ممکن ہے ہمارے
مسلمانوں کے اسلاف کا حافظہ اس قدر روشن تھا کہ آج کا انسان اس کا تصور بھی
نہیں کر سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی ابو یوسف صاحب کو اکیس ہزار موضوعات
حدیث یاد تھے اور حضرت عمر کو تمام عرب اقوام کے شجرہ ہائے نسب یاد تھے یہاں
کہ عرب اقوام اپنے گھوڑوں کے انساب (Pedigrees) بھی یاد رکھا کرتے تھے
۔ حضرت امام شافعی نے فرمایا

شکوت الے وکیع سوء حفظی   فاوصانی الے ترک المعاصی

یعنی میں نے اپنے استاد وکیع سے سوء حافظہ کی شکایت کی تو انہوں نے
مجھے گناہ ترک کرنے کی وصیت کی'

اور اب 1975ء میں میرے حافظے کا یہ حال ہے کہ آج سے پندرہ برس
تک جو کچھ حافظہ میں تھا وہ تو اب تک موجود ہے الا ماشاء اللہ لیکن اس کے بعد
کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ ہاں جو چیز پسند آجائے تو نوٹ کر لیتا ہوں اور اسی سے مدد لیتا
ہوں البتہ حیرانی ہے تو اس بات کی کہ آج کل کے بیس بائیس برس کے نوجوانوں کا
حافظہ نہ ہونے کے برابر ہے اس کا جو بھی سبب ہو مگر مجھے تو اس کی علت دراصل
وہی امام شافعی کی شکایت اور ان کے استاد کا جواب ہی صحیح نظر آتا ہے۔

میں نفس سوال سے ذرا بے راہ ہو گیا ہوں' بات یہ ہے کہ علم انسان کی
فطرت میں موجود ہے۔ مگر کلیات اور مجردات کی صورت میں۔ اور عقل بالقوہ
موجود ہے نہ بالفعل چنانچہ ہم طفل شیر خوار کو دیکھتے ہیں اگر اس کو آنکھیں دکھائی
جائیں اور سخت باتیں کی جائیں تو وہ گھبرا کر رونے لگ جاتا ہے اگر اچھی باتیں کی
جائیں یا اسے گدگدایا جائے تو ہنسنے لگتا ہے۔ اگر اسے ہاتھوں میں اٹھا کر ایک اونچی
جگہ سے گرا دینے کی حرکت کی جائے تو متوحش ہو کر رو دیتا ہے صاف معلوم ہوا
علم اس کی فطرت میں موجود ہے لیکن کلیات کی صورت میں وہ اچھی باتوں سے
مسکراتا ہے مگر جزیات سے محض ناواقف ہوتا ہے کیونکہ جزیات کا مرکب کرنا عقل

کا کام ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ قوت سے فعل میں آیا کرتی ہے اس طرح اگر اسے
ڈرایا جائے اور وہ گھبرا جائے تو وہ کلی طور پر تو خوف محسوس کرتا ہے مگر یہ نہیں
جانتا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ لہٰذا علمی کلیات تمام انسانی بچوں میں بالفعل موجود
ہوتی ہیں۔ مگر جیسے کہ ہر انسان کی شکل و صورت دوسرے انسان سے مختلف ہوتی
ہے اس کی آواز دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی وجودی
انفرادیت میں بھی دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتا ہے گو اس کی شکل و صورت
میں ایک حد تک اس کے والدین کے خدوخال بھی موجود ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنی
ایک منفرد اور خصوصی شکل بھی رکھتا ہے جو اس کی انفرادیت سے عبارت ہوتی ہے
اور اسی انفرادیت کی بناء پر وہ ایک خاص علم کا بھی حامل ہوتا ہے جو دوسروں سے
قطعاً" مختلف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عالم بشر میں جو نابغہ افراد (genius)
معرض وجود میں آتے ہیں ان میں سے ہر ایک منفرد علم کا حامل ہوتا ہے مختلف
فلاسفوں اور علم کا جو ذخیرہ فی الحال موجود ہے وہ انہی افراد کے روشن اذہان کا
عطیہ ہے لہٰذا علوم متداولہ میں استعداد بہم پہنچانا حقیقت میں علم نہیں ہوتا اور نہ
ہی اسے حقیقت میں عالم کہا جا سکتا ہے کیونکہ علوم متداولہ کا ظہور اور اس کی
تدوین دوسرے اذہان کا کارنامہ ہوتا ہے اور اس کا حصول صرف استفادہ یا نقل
علوم ہوتا ہے نہ کہ علم، علم صرف وہ ہے جو ایک انسان کی بنیادی فطرت اور
انفرادیت سے تعلق رکھتا ہے مثلاً" علامہ اقبال دوسرے علماء و شعراء کی مانند
صرف ایک عالم اور شاعر تھے علوم متداولہ کے حصول سے فارغ ہو چکے ہیں مگر ان
کی اپنی انفرادیت سے جو علوم پھوٹے وہی ان کی انفرادیت پر دال ہیں جن سے
فلسفہ خودی کا ظہور ہوا۔

میں نے علوم متداولہ کسی کتب سے حاصل نہیں کئے۔ لیکن ذہنی جلا نے
یہ سہولت ضرور بہم پہنچائی کہ مطالعہ کے دوران کسی قدر ان سے آشنا ہو سکا۔ البتہ
یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ میرا وہ انفرادی علم کون سا ہے جو صرف میری شخصیت اور

انفرادیت کی پیداوار ہے جیسے کہ میں اپنے اشعار میں سے کسی اچھے شعر کو منتخب نہیں کرسکتا اس طرح اپنے اس مخصوص تفکر و فلسفہ کی طرف بھی اشارہ نہیں کرسکتا، جو خاص طور پر میرے ذہن کی پیداوار ہو یہ تو مستقبل کا ناقد ہی متعین کرسکے گا کہ میں عالم شہادت میں کوئی نیا فلسفہ لے کر آیا یا وہی لکیر کا فقیر رہا۔ ہوسکتا ہے کہ فن تصوف کے متعلق میری تحریروں میں کوئی ایسی بات آگئی ہو جو دوسرے متصوفین سے مختلف اور نئی ہو۔ کیونکہ مسئلہ وحدۃ الوجود میں کسی حد تک میرے خیالات دوسرے وجودی سالکوں سے کچھ مختلف ہیں اور توحید کے متعلق میرے جو خیالات ہیں ان کی ابتداء یوں ہوئی کہ والدین اور استاد سے سنا ہوا عقیدہ توحید تو سلوک کے دوران جاتا رہا اور الحاد کا دور دورہ ہوا پانچ سال کے بعد الحاد کا زور ٹوٹا اور ذات باری کی موجودگی کا احساس ہوا تو تناسخ کا قائل ہوگیا، پھر واقعات بھی ایسے رونما ہوتے گئے کہ مجھے تناسخ ارواح پر پورا پورا یقین آگیا مثلاً" میں کسی اجنبی مقام کو دیکھتا تو وہ آشنا اور دیکھا بھالا معلوم ہوتا۔ حتیٰ کہ ان راستوں سے بھی واقف ہوتا جو اس طرف گئے ہوتے تھے لیکن تین سال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ تناسخ کا عقیدہ ایک نفسیاتی اشتباہ سے عبارت ہے اور وہ یوں کہ ہم جس شے کو دیکھتے ہیں یا جو آواز سنتے ہیں غرضیکہ حواس سے جن اشیاء کو محسوس کرتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتیں بلکہ تحت الشعور میں موجود رہتی ہیں پھر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد یا تو لاشعور میں اتر کر انسانی شخصیت کا جزو بن جاتی ہے اور یا تحت الشعور میں ان کا عکس دھندلا ہوجاتا ہے کہ وہ تقریباً" بھولی بسری شے بن جاتی ہیں لیکن جب ہم کسی ایسے مقام کو دیکھتے ہیں جو اس قدیم دیکھے ہوئے مقام سے کسی قدر مشابہ ہو تو تحت الشعور کا وہ نقش ابھر آتا ہے گو ہم اسے بھولے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ اشتباہ پیدا ہوجاتا ہے کہ اس مقام کو میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں اور یہاں آتا رہا ہوں چنانچہ جب پاکستان جمہوریہ بنا اور کوہاٹ کے ایک مشاعرے میں مجھے شمولیت کی دعوت دی گئی اور میں پہلی دفعہ کوہاٹ گیا تو کوہاٹ کے بازار کو

دیکھتے ہی وہ کیفیت طاری ہوگئی کہ "میں یہاں پہلے بھی آچکا ہوں" اب میں چونکہ اس اشتباہ کی وجہ سمجھ چکا ہوں اس لئے سوچنے لگا کہ ایسا کون سا مقام ہوسکتا ہے جو کوہاٹ کے بازاروں سے مشابہت رکھتا ہے چنانچہ دیر تک سوچنے کے بعد میرے دل میں اطمینان کی روشنی پیدا ہوئی اور میں اس کا سبب معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور وہ یوں کہ 18-1917ء میں جبکہ میں نابالغ بچہ تھا اور پشاور شہر آیا تھا تو اس زمانے میں ڈبگری بازار کا نقشہ بعینہ کوہاٹ کے موجود بازار کے مشابہ تھا اور پھر حیرانی ہوئی کہ دنیا کی بڑی بڑی شخصیتیں تناسخ پر یقین رکھتی تھیں اور اس اشتباہ سے عمر بھر نہ نکل سکیں تو معلوم ہوا کہ شخصیت کی تکمیل کی راہ میں یہ تمام مرحلے آیا کرتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان تمام منزل طے کرسکے، کوئی الحاد کوئی تناسخ اور اس طرح کوئی کسی اور مقام پر پہنچتا ہے تو وہیں ٹھہر جاتا ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ مرنے کے بعد اس مقام سے آگے بڑھے افلاطون کا بھی یہی خیال ہے کہ حقیقی علم کی منزل موت کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔

تناسخ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہم سب ذات باری کے وجود کے اندر موجود ہیں۔ چنانچہ کئی فلاسفہ مثلاً" سپنوزا وغیرہ اس عقیدے کے قائل تھے اور میں بھی اور ایک وقت تھا اس کا قائل رہا لیکن بعد میں ہمہ اوست کا مقام آیا، اور یاد رہے کہ ہمہ از اوست کو تو بچہ بھی سمجھ سکتا ہے یہ انسانی علم کی ابتداء سے تعلق رکھتا ہے اور شیخ احمد سرہندی صاحب نے اسے وحدۃ الوجود کی مخالفت میں پیش کیا ہے جس پر میں نے ایک مکمل کتاب "وجود و شہود" لکھی ہے جو شائع ہوگئی ہے شیخ احمد سرہندی کو ابتداء میں جو وحدۃ والوجود کا تصور حاصل ہوا تھا وہ ان کے شیخ حضرت خواجہ باقی اللہ کی توجہ کا اثر تھا خود جناب شیخ کا "عین" اس عقیدہ سے متحد نہ تھا اور یہی ان کا مقام تھا لیکن ہمہ اوست میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ بھی مکمل حقیقت نہیں کیونکہ لفظ "ہمہ" خود کثرت پر دال ہے لہٰذا صحیح قول اور علم ہمہ اوست نہیں بلکہ صرف "اوست" ہے اور اب اس میں بھی ایک اشتباہ

باقی رہا جو عرصے تک باعث پریشانی رہا اور وہ یہ کہ "اوست" کہنے والا خود موجود ہے تو اب انا تو ثابت ہوا کہ ایک کے ساتھ ہی ساتھ دوسرا یعنی کہنے والا بھی وجود رکھتا ہے جو دوئی سے عبارت ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ اشتباہ بھی باقی نہ رہا اور معلوم ہوا کہ "اوست" کہنے والے کی "انا" اور اس کی "انا" جسے کہنے والا "اوست" کہتا ہے ایک ہی ہے اور کوئی مغائرت نہیں لیکن اس کو سمجھنا ذرا مشکل ہے چنانچہ حسین ابن منصور نے جو "انا الحق" کہا تھا، اور بقول مولانا رومی اور شیخ مجدد سرہندی لوگ اسے نہ سمجھ سکے اور اسے قتل کردیا۔ حالانکہ وہ کلام حق تھا۔ یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ہی انا حق تھا، کثرت اور دوئی کا کوئی شائبہ نہیں اس لئے جو فلاسفہ تخلیق کائنات کی علت حرکت حبی کو بتاتے ہیں اور حدیث "کنت کنزا" مخفیا فاحببت ان عرفا" پیش کرتے ہیں وہ مبتدی لوگوں کے سمجھانے کے لئے ہے نہ کہ حقیقت۔ کیا حق تعالیٰ بھی کسی کی محبت سے متاثر ہو سکتا ہے اور اس تاثر کی وجہ سے تخلیق کائنات کا جذبہ اسے حرکت میں لا سکتا ہے حق تعالیٰ کی نسبت یہ محال ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ صرف وہ خود موجود ہے وہ ایک "انا" ہے اور بقول علامہ اقبال انا سے صرف انیتوں ہی کا صدور ممکن ہے اس لئے کائنات کی ہر شے ایک انا ہے صاف ظاہر ہے کہ اشیاء کی انیتیں اسی ایک "انا" کا پرتو ہیں، آئینہ خانے میں اگر ایک شخص کا عکس متعدد نظر آتا ہے تو اس سے وہ شخص متعدد اور تقسیم نہیں ہوتا بلکہ وہی ایک شخص حقیقت میں موجود ہوتا ہے۔ اور کائنات خارجی کیا ہے۔ وہی معلومات الہیہ جب اسم الباطن سے اسم الظاہر پر پرتو افگن ہوتی ہیں تو اشیاء کی صورت اختیار کرتی ہیں اور وہ سب ایک دوسرے کے سامنے آجاتی ہیں اور اسی سے کائنات خارجی کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن جب ایک سالک مکمل طور پر مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کی اپنی انا اسی حقیقی انا میں محو ہو گئی تو ایک انا کے سوا کوئی محسوس چیز باقی نہیں رہتی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے افکار مطالعہ سے پیدا نہیں ہو سکتے، جب تک یہ

فطرت انسانیہ میں کلیات کی صورت میں مندرج نہ ہوں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان جیسے افکار کا حامل لکھا پڑھا ہو کیونکہ بکثرت ایسے امی گزرے ہیں جو اس قبیل کے افکار کے حامل تھے چنانچہ خود آنحضرت بھی امی ہی تھے مگر زندگی کا جو ضابطہ انہوں نے دنیا کو پیش کیا دوسرے کسی پڑھے لکھے فاضل کے بس کا روگ نہیں چنانچہ میرے ایک پیر بھائی خان فضل خان جو علاقہ ہشت نگر موضع غزبک کے رہنے والے اور اچھے خاصے زمیندار تھے بالکل امی محض تھے مگر مسئلہ وحدۃ الوجود میں عجیب و غریب نکات کا اظہار فرماتے بلکہ بحث فرماتے اور ابتلا اس حد تک تھا کہ ان کی آبی زمین میں کوئی فصل نہیں ہوتی تھی اور اگر ہو بھی جاتی تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آتا اور یہی وجہ تھی کہ وہ سرکاری مالیہ کے زیر بار ہونے کے سبب حوالات میں ڈال دیئے گئے اس وقت وہاں کے افسر مال سابق گورنر محمد اسلم خان خٹک کے والد قلی خان ہوا کرتے تھے۔ انہیں خان فضل خان کے خیالات کا علم ہو چکا تھا اسے لوگوں نے بتایا تھا کہ فضل خان ہر شے کو خدا سمجھتا ہے، لہٰذا قلی خان ان سے ملنے حوالات گئے اور جاتے ہی پوچھا "کیا وہ فضل خان تم ہی ہو جو ہر شے کو خدا کہتا ہے۔" جواب دیا کہ ہاں وہ میں ہی ہوں۔ پوچھا "پھر تم کیسے خدا ہو کہ میں تجھے حوالات میں بند کرنے پر قادر ہو سکا" فضل خان نے جواب دیا، نیک بخت چھوٹے بڑے کا خیال رکھا کرو نا، گو مجھے ان کے وحدۃ الوجود کے چند جزیات سے اختلاف تھا اور میں گو اس وقت صرف اکیس بائیس برس کا تھا مگر میں ان سے بحث کیا کرتا تھا اور آج بھی ان وجودیوں کا مخالف ہوں جو ہر شے کو خدا سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وجود کی ماہیت تک پہنچنے میں ناکام ہوتے ہیں حتیٰ کہ بڑے بڑے فاضل بھی وجود کے سلسلہ میں تاریکی میں رہے ہیں اور تو اور خود حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی بھی "وجود" کی حقیقت تک پہنچتے پہنچتے راہ میں ہی رہ گئے تھے اور ان کے ذہن سے وجود کا تصور کرتے وقت جسمیت خارج نہ ہو سکی تھی حالانکہ وجود نہ جسم ہے نہ روح مادہ ہے نہ ہیولا، وہ حق تعالیٰ کی ذات کی حقیقت

ہے 'ذات سے زیادہ اہم ۔ کیونکہ ذات کی تعریف تو یہ ہے کہ وہ چند خصوصیات کی
وجہ سے دوسری شے سے ممتاز ہو ۔ مگر "وجود" تو ایک ذات کے "ہونے" اور بودن
سے عبارت ہے اگر وجود نہ ہو تو ذات کی نفی ہو جاتی ہے آخر ذات کے سلسلہ میں
بھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ "ذات موجود" ہے اس لئے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر شے
کا وجود حق تعالیٰ کا وجود ہے یعنی ہر شے حق تعالیٰ کے ہونے سے ہے مگر یہ کہنا صحیح
نہیں کہ ہر شے "وہی" ہے یعنی ہمہ اوست ' اشیاء کو اگر موجود کہا جاتا ہے تو صرف
اس لئے کہ وہ متصف بالوجود میں وجود کے مظاہر ہیں ۔ نہ کہ عین وجود ۔ وجود صرف
ایک ہے اور اس کے مظاہر لاتعداد اور پھر ہر مرتبہ میں وجود کا حکم جدا ۔ خدا خدا ہے
اور عبد عبد ہے ۔ جیسے کہ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی نے فرمایا ہے **الحق
حق ولو تزالا والعبد عبلو لو ترقی** حق حق ہے چاہے وہ نزول کرے اور بندہ بندہ
ہے گو وہ ارتقاع اور ترقی پائے ۔

سوال 3:۔ شاعری کی طرف رجحان کیونکر ہوا؟

جواب :۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری ایک فطری استعداد کی وجہ سے عالم
ظہور میں آتی ہے جب تک اس فن سے فطری مناسبت نہ ہو اس کا ظہور ناممکن
ہے البتہ اس کی مثال یوں ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے مگر جلتا صرف وہی
چراغ ہے جس میں تیل اور بتی موجود اور اگر بتی روشن نہ ہو سکے تو فطری استعداد
انسان کو بے قرار و پریشان رکھتی ہے اور پھر بھی کسی نہ کسی غیر مرتب صورت میں
ظاہر ہوا کرتی ہے چنانچہ مجھے لڑکپن سے ہی غزلیں ' چار بیتے اور ٹپے پسند تھے اور
چونکہ حافظہ بہت اچھا تھا اس لئے کئی غزلیں اور چار بیتے حفظ ہو گئے تھے آواز بھی
ایک حد تک اچھی تھی اور شاید یہی قرینہ تھا میری شاعرانہ استعداد کے ظہور کا ۔
جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اس وقت اسلامیہ کالج پشاور کے ایک طالب
علم شہزادہ سکندر شاہ ہوا کرتے تھے وہ بخارا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے
اور اردو شعر کہا کرتے تھے چنانچہ ان کے اشعار سے متاثر ہو کر میں بھی شعر کہنے لگا
اور ایک دفعہ غزل کے چند شعر لکھ کر دکھائے مگر انہوں نے پسند نہیں کئے بعد میں
مولانا عبدالقادر مرحوم کو دکھائے جو اس وقت آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے
انہوں نے پسند فرمائے مناسب اصلاح دی اور حوصلہ افزائی کی اس وقت مجھے یاد
نہیں آرہا کہ وہ اشعار کیا تھے بہرحال تھوڑے بہت لکھے تھے اور کہیں پھینک دیئے
تھے اور سکول سے چلے جانے کے بعد خیالات نسیا" منسیا" ہو گئے یہ خیال بھی نہیں
آیا کہ کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھنا چاہئے ۔ 26-1925ء میں جب خیبر ریلوے بن
رہی تھی اس میں حکومت نے میرے والد کو بھی ٹھیکہ دیا تھا تب میں بھی اپنے
منشیوں کے ساتھ کام کیا کرتا تھا چنانچہ اس وقت موضع سپیر سنگ تحصیل پشاور سے
قلیوں کی ایک کھیپ ہمارے کام کے لئے آ حاضر ہوئی ان مزدوروں میں ایک ای
شاعر بھی تھا جو فی البدیہہ کہا کرتا تھا ' کسی نے ایک شے کی طرف اشارہ کرکے کہا
کہ اس سے پر کچھ کہو اور وہ بے دھڑک کہنے لگا اور اشعار خود بخود ڈھلتے چلے

آتے میرے عزیزوں نے ایک دفعہ میرے سامنے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کئے تو میں نے کہا کہ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ لاؤ کاغذ کہ میں ابھی تمہیں لکھ دوں چنانچہ وہ ہمارے ایک منشی سے کاغذ لے کر آئے اور میں فی البدیہہ لکھنے لگا اور ایک ہی نشست میں دو چار بیتے لکھ کر دے دیئے میرا خیال تھا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی شعر لکھ سکتا ہے چنانچہ ریلوے کی تکمیل کے بعد پھر لکھنے خیال نہیں رہا البتہ طبیعت میں اضطراب اور پریشانی ہمیشہ موجود رہا کرتی چنانچہ میں اردو میں افسانے وغیرہ لکھنے لگا جو لاہور کے ہفتہ وار اخبار پارس میں شائع ہوتے اور کبھی کبھی غزل میں لکھ لیتا وہ بھی اردو میں۔ تب میں اپنے شیخ حضرت سید عبدالستار شاہ صاحب کی صحبت میں بھی زیادہ رہا کرتا گو بیعت میں نے 1933ء میں کی ان دنوں میں نے جو اردو غزلیں لکھیں ان میں صرف ایک مطلع اس وقت یاد آرہا ہے

منزل جبریل ہے منزل میرے اک گام کی
شجر طوبیٰ سیر گہ میری ہے صبح و شام کی

اسی سال حضور مرشد نے ہدایت فرمائی کہ میں اردو کی بجائے پشتو میں لکھا کروں اگرچہ اردو کو ترک کرنا شاق گزرتا تھا حکم حاکم مرگ مناجات۔ میں نے پشتو میں لکھنا شروع کیا اور چونکہ اس زمانے میں پشتو شعراء کا معیار ایسا نہ تھا جسے علمی معیار کہا جاتا اور نہ ایسے شاعر تھے جو صرف پشتو ادب کی ترقی کے لئے لکھتے ہوں اس لئے میں آہستہ آہستہ اس میدان میں آگے بڑھنے لگا، مرشد نے فرمایا تھا کہ تجھ سے اللہ تعالیٰ بھی باز پرس کرے گا کہ تم نے اپنی استعداد کو دوسری زبانوں پر کیوں ضائع کیا، کیا تجھ پر سب سے پہلے حق زبان کا نہ تھا حضور کا یہ طریقہ تھا کہ اگر کوئی پختون قوال اردو یا فارسی کلام سنانے لگتا تو حضور اسے توجہ سے سماعت فرماتے مگر خاتمے پر پوچھتے "پشتو نہیں آتی" جواب دیتا "آتی ہے" حضور فرماتے پھر پشتو میں کیوں نہیں گاتے یوں میں مکمل طور پر پشتو میں لکھنے لگا میں نے

نظمیں رباعیات اور قطعات بھی لکھے مگر رجحان زیادہ تر غزل کی طرف تھا اس لئے اب تک غزل ہی کہتا ہوں اگر مجھے اپنے معاصر بابائے غزل کہتے ہیں تو اس حد تک صحیح کہتے ہیں کہ میں نے تمام تر توجہ غزل ہی پر مرکوز رکھی اور مجھے یہ باور کرنے میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے معاصرین میں سے کسی شاعر نے اتنی غزلیں نہیں لکھیں جتنی میں نے لکھی ہیں غزل کے معنی بھی چونکہ عورتوں سے باتیں کرنا ہے اس لئے یہ تمام اصناف شعر میں بے حد لطیف اور نازک صنف ہے اشاریت اور تلازم بعید سے تعلق رکھتا ہے موقیت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ گو حضرت علامہ اقبال کے تتبع میں اب غزل زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاس ہے مگر میں نے اپنی غزل میں زندگی کے اکثر پہلوؤں کی عکاسی کرنے کے باوجود بھی اس کی حقیقی روح کو قائم رکھا اور اسے مجروح نہ ہونے دیا میں نے اگر محبوب کی آنکھوں زلفوں اور ابرو اور مژگان کی تعریف کی تو وہ آنکھیں زلفیں ابرو اور مژگان بھی پختون ہی ہوتے تھے اور میری غزل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر اسے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے تو قاری اسے پڑھتے ہی سمجھ جائے کہ غزل کہنے والا پختون قوم سے تعلق رکھتا ہے اور یہ اس لئے کہ میں نے اپنی غزل میں پختون تہذیب و تمدن اور قومی اقدار کو بیان کیا ہے، مثلاً "پختونوں کی ایک قومی قدر "تیگہ" ہے تیگہ پشتو میں پتھر کو کہتے ہیں۔ "کانڑے" بھی پتھر کو کہتے ہیں چنانچہ جب دو گروہوں کے مابین وقتی صلح کرائی جاتی ہے تو اسے تیگہ یا کانڑے کہتے ہیں پشتو میں کہتے ہیں "تیگہ یے کیخودہ" یعنی پتھر رکھا گیا۔ ہنگامی اور موقتی صلح کرائی گئی اب اس پر میرا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

آخر بہ تیگہ کرے زما او د رقیب مانہ
تہ بہ اشنا ور سرہ پسے جنگوے سترگے

یعنی "اے محبوب آخر تم میرے اور رقیب کے درمیان رکھا ہوا صلح کا پتھر توڑ دو گے جبکہ تم اس کے ساتھ حسب معمول آنکھوں کی جنگ جاری رکھے ہوئے

ہو"

اس طرح پختونوں میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ اول تو خون معاف نہیں کرتے اگر معاف کرنا ہو تو پھر خون بہا کے طور پر روپے قبول نہیں کرتے بلکہ دو نوجوان لڑکیاں طلب کرتے ہیں جنہیں (سورے یا سپرے) یعنی سوار کہا جاتا ہے کیونکہ وہ لڑکیاں گھوڑوں یا خچروں پر سوار کرا کے بھیج دی جاتی ہیں اس پر میرا ایک شعر ہے۔ صرف ترجمہ پیش کرتا ہوں

"میں نے جی بھر کر دیکھا تو گویا آپ کی حیا کا قاتل ٹھہرا لہٰذا میری یہ دونوں آنکھیں بطور (سورے یا سپرے) حاضر ہیں۔"

غزل کی طرف میرے زیادہ تر رجحان کا سبب شائد میرا ذوق جمال ہو گو ذوق جمال تمام انسانوں کو ودیعت کیا گیا ہے مگر فرق غزل کے معیار کا ہے، پھر معیار میں بھی یہ فرق ذہن نشین رہے کہ جس شخص کا بھی معیار حقیقت حسن یا حسن اکبر کے جتنا قریب ہو گا اس کا ذوق بھی دوسروں کی نسبت بہتر ہو گا اور چونکہ میں عالم مثال کا قائل ہوں اس لئے یہ عقیدہ بھی رکھتا ہوں کہ تمام اقدار کی اصلیں عالم مثال میں موجود ہیں اور عالم مادیت میں صرف ان کے اشباح ہی موجود ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں افلاطون سے اسلام کے متصوفین بھی متفق ہیں اور ظاہر ہے کہ اقدار بنفس خویش عالم مادیت میں موجود نہیں ہیں بلکہ چند اعمال کے معرض ظہور میں آنے سے ان کا تعلق ہوتا ہے مثلاً "عدالت یا عدل اور ظلم۔ ہر دو حالات میں قتل کیا جاتا ہے عدالت قاتل کو قتل کی سزا دیتی ہے اور ظالم بھی قتل کا مرتکب ہوتا ہے اب ان ہر دو اقدار کا ادراک یا احساس چند اعمال ہی سے ہو سکتا ہے چنانچہ ہماری انا جس شے کو عدل اور جس شے کو ظلم سمجھتی ہے اس کا مکمل تصور یا اس کی صورت غیر مدرک ہے صرف اس کا احساس ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ قدریں اپنا ایک مجرد وجود رکھتی ہیں اور چونکہ انسانی انا غیر فانی غیر متغیر اور غیر مخلوق ہے اس لئے مجرد ہے لہٰذا وہ ان مجرد اقدار کا احساس کر سکتی ہے مگر چونکہ یہ

انا مادی جسم سے بھی ملحق ہے اس لئے مادیت سے ملوث ہونے کی وجہ سے وہ ان مجرد اقدار کا صرف احساس کر سکتی ہے ان کی مکمل ماہیات کے ادراک سے قاصر ہے چنانچہ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا اور وہ یوں کہ ایک دفعہ میں اپنے شیخ حضرت سید عبدالستار شاہ صاحب کے ہمراہ عرس میں حضرت خواجہ خواجگان معین الدین حسن سنجری میں شامل ہونے کے لئے اجمیر شریف روانہ ہوا حضور کے ایک افریدی خلیفہ مولوی شیر محمد صاحب مرحوم بھی معہ دو مریدوں کے ساتھ تھے چنانچہ فتح پوری دہلی کے ایک ہوٹل میں شب بھر کے لئے ٹھہر گئے، ہوٹل کا ایک ملازم آیا اور حضور مرشد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "خان صاحب ہمارے ہاں خوبصورت سے خوبصورت مال مل سکتا ہے" میں انفعالی حالت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا اور حضور مسکرا رہے تھے فرمایا، ان خان صاحب کو لے جا کر اپنا مال دکھا دو یہ شاعر بھی ہیں اچھا انتخاب کریں گے آہستہ آہستہ میری جرات بھی عود کر آئی عرض کیا جی جناب بے شک اچھا شاعر ہی بہترین حسن کا انتخاب بخوبی کر سکتا۔ فرمایا! "نہیں ہم تم سے اچھا انتخاب کر سکتے ہیں کیونکہ ہم ابھی تک اس میدان کی شاہ سواری سے محروم ہیں۔" چنانچہ میں ہوٹل کے ملازم کے ساتھ باہر چلا گیا اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اندر چند لڑکیاں بیٹھی تھیں، کہنے لگا "منتخب کر لو شاعر صاحب" میں نے کہا کہ او کم بخت یہ تو نے کیا کیا وہ تو پیر صاحب ہیں حیران ہو کر کہنے لگا واہ یہ کیسے پیر ہیں خانوں اور نوابوں جیسا لباس ہے نہ جبہ ہے نہ دستار"

سوال 4 :- کیا آپ پشتو کے علاوہ کسی دوسری زبان کی شاعری سے واقف و متاثر ہیں

جواب :- اس سوال کا جواب دینا ذرا مشکل ہے اس لئے کہ میں اردو زبان کو تو بے حد پسند کرتا ہوں اور جیسا کہ لکھا گیا میں ہمیشہ اردو کے امتحان میں اول ہی آیا کرتا تھا، مگر اردو شعراء کا کلام بے حد کم نظر سے گزرا ہے مثلاً "نویں جماعت تک نصاب میں جو اردو شاعری تھی پڑھی لیکن سکول سے جانے کے بعد شاذو نادر ہی کسی اردو شاعر کا مطالعہ کیا ہے میں نے جناب اسد اللہ خان غالب کا اردو دیوان بھی تمام و کمال نہیں پڑھا کیونکہ اس وقت وہ میری سمجھ سے بلند تھا مگر بعد میں جب شاعری میں کچھ شد بد پیدا ہوئی تو تب بھی مرزا صاحب کی چند غزلیں ہی نظر سے گزریں اور بلاشبہ میں ان کی شاعری سے متاثر ہوا مگر وہ تاثر اس قدر بھی نہیں تھا کہ میرے ذہن پر چھا جاتا اور انگریزی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ میری انگریزی اس قابل کہاں تھی کہ انگریزی کے عظیم شعراء کا مطالعہ کر سکتا۔ عربی میں بھی اس قدر استعداد نہ تھی اور فارسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں نے سکول میں فارسی کی بجائے عربی لی تھی لیکن اردو کے کثرت سے مطالعہ کرنے کی وجہ سے تھوڑی سی فارسی بھی سمجھنے لگ گیا تھا اور پھر خواجہ حافظ اور شمس الدین تبریزی کی چند غزلیں زیر مطالعہ آئیں بعد میں مثنوی معنوی کا مطالعہ کیا مگر وہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لئے کہ وہ میری علمی استعداد سے بہت بلند تھی مگر پھر بھی فارسی میں کچھ شد بد پیدا ہوئی البتہ شمس الدین تبریزی اور خواجہ حافظ کی چند غزلوں سے ضرور متاثر ہوا، یہ تاثر تصوف کے حقائق اور شاعرانہ خصوصیات کے متعلق تھا، چنانچہ بعد میں جب مولانا عبدالقادر صاحب ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی کی طرف سے علامہ اقبال کا جاوید نامہ پشتو شعر میں ترجمہ کرنے کے لئے دیا گیا تو میں نے اس کا ترجمہ کیا، گو بعض دفعہ مشکل الفاظ کی وجہ سے لغت دیکھنے کی ضرورت پیش آئی اور تصحیح کرائی گئی البتہ اردو شاعری میں جناب جگر مراد آبادی صاحب کی

چند غزلوں نے متاثر کیا اور جب جگر صاحب کل ہند اردو مشاعرے کے لئے پشاور تشریف لائے اور اسلامیہ ہائی سکول کے لان میں مشاعرہ منعقد ہوا تو میں اس کی غزل سے مزید متاثر ہوا اور جب اس کا انتقال ہوا تو میں نے اردو میں ایک غزل لکھی جس کا مقطع یہ تھا

ملتفت ہوتی نہیں ، "خون جگر" پیکر غزل
گو نظامی ان کی بزم ناز میں پیہم گئے

اس سے مترشح ہے کہ میں مکمل طور پر کسی غیر زبان کی شاعری سے متاثر نہیں ہوا اور میری شاعری میں فارسی یا اردو تخیلات، اصلاحات اور تشبیہات کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے میں نے شاذو نادر ہی کسی فارسی یا اردو شعر سے استفادہ کیا ہے اس لئے میری شاعری خود میرے اپنے تخیلات سے عبارت ہے یہ بات میری ایک کتاب "یون" سے بخوبی معلوم کی جاسکتی ہے "یون" پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے شائع ہوئی ہے "یون" کے معنی پشتو میں مرحلہ وار آگے بڑھنے کے ہیں۔ اس لئے میں نے یہ کتاب تاریخ کے لحاظ سے مرتب کی ہے جس میں 1933ء سے 1940ء اور پھر 40ء سے 50ء اور 60ء تک تاریخ وار غزلیں مرتب کی ہیں تاکہ ایک ناقد میری غزل کے ارتقاء پر پوری نظر رکھ سکے۔ 60ء کے بعد کی تمام غزلیں غیر مطبوعہ ہیں۔

سوال 5:- موسیقی سے آپ کو کس قدر دلچسپی ہے؟

جواب:- بہت زیادہ ' ظاہر ہے کہ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے کوئی شاعر موسیقی کے فطری امتزاج کے بغیر شاعر نہیں ہو سکتا اور پھر غزل کی شاعری تو ہے ہی موسیقی سے عبارت۔

شاعری بغیر وزن کے دل کش رہ ہی نہیں سکتی ' اور وزن بغیر موسیقی محال ہے چنانچہ جب کوئی نیا شاعر اصلاح لینے کے لئے میرے پاس آتا ہے میں اس سے یہی پوچھتا ہوں کہ موسیقی سے شغف ہے یا نہیں اگر اثبات میں جواب دے تو اس سے کچھ گانے کی فرمائش کرتا ہوں اگر وہ تال کے موافق گائے تو میں اسے مشورہ دیتا ہوں چنانچہ وہ لوگ جو موسیقی سے تہی دامن ہوتے ہیں وہ بے حد خشک اور اکھڑ طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں ان میں رحم و عفو کا مادہ بے حد کم ہوتا ہے وہ ذوق حسن سے بڑی حد تک محروم ہوتے ہیں چنانچہ شاعری کے لئے ذوق حسن کے ساتھ ہی ساتھ قوی ارادہ اور عزم صمیم کی بھی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ ان لوگوں کا خاصہ ہو سکتا ہے جو شاعری سے عشق رکھتے ہیں اور عشق بھی وہی رکھتے ہیں جن کی فطرت میں ذوق جمال اور شاعرانہ خصوصیات کی وافر استعداد ہوتی ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ موسیقی سے شغف میری گھٹی میں پڑا ہے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ میرے والد صاحب بہت اچھا رباب بجایا کرتے تھے ' اور وہ اس لئے بھی کہ جب ہمارے ملک میں باہمی دشمنی نے زور پکڑا تو میرے خاندان کے لوگ بھی اور دشمن بھی قلعہ بند ہوگئے ' کوئی انسان دن کی روشنی میں باہر نکلنے کی جرات نہ کرسکتا تھا یہاں تک کہ گھر کی مرغیوں کو بھی بند رکھا جاتا ہے کیونکہ مرغیوں کو بھی نشانہ کے بغیر نہ چھوڑتے تھے ' مگر بعد میں فریقین کے درمیان سمجھوتہ کے طور پر خواتین کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ان پر گولی نہیں چلائی جاتی تھی چنانچہ قلعہ بندی کے دنوں میں میرے والد برج میں بیٹھے ہوئے رباب ہی سے جی بہلایا کرتے پھر میرے دوسرے بھائی یار محمد خان جس کا تذکرہ ہوچکا ہے شاعر بھی تھے اور رباب

بھی بجا سکتے تھے مگر میرے تیسرے بھائی ملک باور خان کی رباب بجانے میں مثال نہیں تھی۔ اس فن میں وہ ضرب المثل ہوچکے تھے اور جب کبھی کسی ربابی کی تعریف کی جاتی تو کہا جاتا "بس باور خان ہی سمجھ لو" اس کے بعد میرے چوتھے بھائی جو مجھ سے بڑے تھے رباب کے ساتھ ہی ساتھ گا بھی خوب سکتے تھے اور سب سے چھوٹا میں اپنے بھائی باور خان سے متاثر ہو کر رباب سیکھنے لگا اور کچھ عرصہ کے بعد حالت یہ ہوئی کہ باور خان سے بھی بڑھ گیا چنانچہ باور خان میرے شیخ حضرت سید عبدالستار شاہ صاحب کو بلاناغہ ہر رات رباب بجا کر سنایا کرتے تھے مگر بعد میں جب وہ میرے بڑے بھائی کی وفات کی وجہ سے ملک بنے اور ذمہ داریاں گلے آپڑیں تو پھر ان کی جگہ میں نے لے لی اور اب حضور کو رباب بجا کر سنانا میرے فرائض میں شامل ہوگیا چنانچہ ایک دن حضور نے فرمایا "باور خان عرصہ سے تمہارا رباب نہیں سنا" کہنے لگے ' حضور! حمزہ مجھ سے اچھا بجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے اجداد میں رباب بجانے کا ہنر موجود ہو اور قانون توارث کے تحت وہ ان کی اولاد میں منتقل ہو کر آیا ہو ' لہذا میرے بھتیجے بھی موسیقی کے گرویدہ ہیں ' میرا چھوٹا بھائی محمد خان (جو عرصہ سے علیل ہے) بھی اس کا شغف رکھتا ہے مگر میرے بھتیجوں سے کسی قدر کم۔ وہ شاعر بھی ہے اور عرصہ تک سرکاری ملازمت میں رہا ہے۔ میرا بڑا بھتیجا ملک شہزاد خان جو باور خان کا اکلوتا بیٹا ہے بینجو خوب بجاتا ہے اچھا شاعر ہے میرا لڑکا مراد اچھا شاعر ڈرامہ نویس اور ادیب ہے وہ کوئی ساز تو نہیں بجاتا مگر موسیقی میں کافی مہارت رکھتا ہے لہذا چند پشتو فلموں کی دھنیں بھی ترتیب دے چکا ہے تو بس فارسی کی یہ ضرب المثل صادق آرہی ہے "ایں خانہ ہمہ آفتاب ہست"

سوال نمبر6:۔ کیا شاعر کے لئے شاعری کے علاوہ موسیقی کا علم ضروری ہے اگر ہے تو کیوں؟

جواب:۔ اس کا جواب پانچویں سوال میں دیا جا چکا ہے۔

سوال نمبر7:۔ آپ بحیثیت اہل قلم کسی خاص نکتہ نظر کی حمایت کے قائل ہیں؟

جواب:۔ اگر اس سوال سے آپ کا مدعا یہ ہو کہ شاعر یا اہل قلم کو ایک خاص نکتہ نظر کی حمایت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ذہن انسانی ہر آن متغیر اور ارتقاء میں ہے اور ہمیشہ سابق نکتہ نظر کی تردید پر مجبور ہو جایا کرتا ہے کیونکہ سلسلہ ارتقاء ہمیشہ نقص سے کمال کی جانب حرکت پذیر ہے پھر مسئلہ ارتقاء پر یقین کرنے والے یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ سلسلہ ارتقاء غیر مختتم ہے اور ساتھ ہی وہ اس ارتقائی حرکت کا کوئی محرک بھی تسلیم نہیں کرتے تو صاف ظاہر ہوا کہ نہ ہمارے علوم ہی حقیقت میں علوم ہیں اور نہ ہماری عقل و فراست کوئی چیز ہے اور یہ کہ عالم مادی اور اس کی تمام اشیاء ہمیشہ کے لئے نقطہ نقص پر ہی موجود ہوں گی تو اس قسم کے نظریات کے خلاف میں ضرور ایک خاص نکتہ نظر کا قائل ہوں اور وہ اس لئے کہ اشیائے کائنات کی یہ تغیر اور مسلسل حرکت بغیر ایک علت فاعلی کے ناممکن ہے اور پھر اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ ارتقاء کی ہر حرکت نقص سے کمال کی طرف ہوا کرتی ہے ایک ذی علم کے لئے علت فاعلی کے وجود پر کھلی اور روشن دلیل ہے کیونکہ نقص کے خلاف کمال کی طرف حرکت دینا ایک روشن ذہن کے وجود پر دلالت کرتا ہے لہٰذا ارتقائی عمل کے لئے ضروری ہے کہ وہ نقطہ کمال پر پہنچ کر ختم ہو جائے ورنہ پھر ہر نقطہ پر نقص کا موجود رہنا ضروری ہو گا پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانات کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے سو اگر پانی بھی دوسری اشیاء کی مانند ارتقاء کی زنجیروں میں جکڑا ہوا آگے ہی آگے حرکت کرتا رہتا تو کوئی جاندار بھی زندہ نہ رہنے پاتا بلکہ سائنس

تو بتاتی ہے اگر ہائیڈروجن اور آکسیجن کا یہ اتحاد اپنے موجودہ اندازے کے خلاف واقع ہوتا تو پانی ایک ایسے زہر میں تبدیل ہو جاتا ہے جسے پی کر کوئی جاندار زندہ نہ رہنے پاتا، چنانچہ ابتدائے دنیا سے پانی جیسا تھا ویسا اب تک ہے اور ہمیشہ ایسا رہے گا چنانچہ میں اس نکتہ نظر کا قائل ہوں کہ مادی ارتقاء اختتام پذیر ہو چکا ہے تمام اشیاء اپنی انفرادیت تک پہنچ چکی ہے انسانی بدن بھی اس ارتقائی عمل سے اس قابل ہو چکا ہے کہ وہ حقائق کا ادراک کر سکے لہٰذا ذہنی ارتقاء تو جاری ہے اور نامعلوم وقت تک جاری رہے گا مگر مادی ارتقاء ختم ہو چکا ہے اور اگر بعض حامیان مسئلہ ارتقاء کا یہی تقاضا ہو کہ مادی ارتقاء بھی جاری رہے گا تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ موجودہ درخت جو ہمیں نظر آتے ہیں ارتقا کرتے کرتے تمام کے تمام پھلوں میں تبدیل ہو جائیں ان کے پتے شاخیں جڑیں اور تمام اجزا فنا ہو کر پھلوں میں تبدیل ہو جائیں، کیونکہ درخت کی علت غائی ہی پھل ہے لہٰذا عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔

اب آپ کے سوال کا دوسرا مفہوم اگر یہ ہو کہ کسی خاص نکتہ نظر کا قائل ہوں تو بے شک جیسے کہ میں نے عرض کیا کسی خاص نکتہ نظر کے قائل نہ ہونے کی صورت میں آپ انسان کے وجود کو حیوان سے زیادہ نہ پائیں گے کیونکہ انسان جسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے اس کی شرافت کا سبب ہی عقل و دانش ہے اور جہاں عقل ہو گی وہاں اصول بھی ہوں گے اور اصول کسی نکتہ نظر سے عبارت ہوتے ہیں لیکن یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے اور کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب آپ مادی ارتقاء کے اختتام کے قائل ہیں اور ذہنی ارتقاء کو ایک وقت نامعلوم تک جاری مانتے ہیں تو پھر عقلی ارتقاء میں بھی تو ہر مقام پر نقص موجود ہو گا اور پھر علوم و فنون کا بھی اعتبار نہ رہے گا تو عرض یہ ہے کہ مادی ارتقاء کی علت غائی اشیائے عذا کی جسمانی تکمیل ہے اور ذہنی ارتقاء ان اشیاء کی معرفت سے عبارت ہے چنانچہ دس ہزار سال قبل یا اس سے بھی زیادہ جو شے موجود تھی وہی شے آج

بھی موجود ہے لیکن اگر اس شے کا مشاہدہ ہمیں دس بیس ہزار سال پیشتر ہوتا تو اس کے پہچاننے سے قاصر ہوتے حالانکہ بنیادی اور حقیقی طور پر یہی شے ہزاروں سال پہلے بھی موجود تھی جو آج موجود ہے اور اسے نئی شے کہنے یا سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس شے نے اپنی انفرادیت کے حصول کی راہ میں کئی رنگ بدلے اور آخر اپنے حقیقی وجود تک پہنچی اس کی مثال یہ ہے کہ اب ایک تین سالہ بچے کو دیکھیں اور پھر مسلسل اسے گاہ بگاہ دیکھتے رہیں تو جب یہ لڑکا بڑھے گا، جوان ہوگا کہولت کے زمانے میں پہنچے گا پھر بوڑھا ہوگا مگر آپ کے نزدیک اس کی شخصیت اور ایک معین شکل و صورت ہمیشہ موجود رہے گی اور آپ اسے ہمیشہ پہچانتے رہیں گے مگر یہی بچہ اگر دو چار بار یا اس سے بھی زیادہ آپ کے مشاہدہ میں آئے اور پھر بیس پچیس برس تک آپ اسے نہ دیکھ سکیں تو ملتے وقت ہرگز نہ پہچان سکیں گے اگر آپ سے کوئی کہہ دے کہ یہ فلانا ہے تو آپ کا حافظہ پہلے تو اس سے انکار کرے گا مگر بعد میں جب آپ حافظہ پر زور دیکر سوچیں گے اس کی شکل و صورت کا ایک ہلکا سا تاثر حافظے کی سطح پر ابھرے گا چنانچہ یہی حال اشیائے عالم کا ہے کہ شے وہی ہوتی ہے جو ہزاروں لاکھوں سال قبل تھی مگر حرکت ارتقائی کی وجہ سے ہر لحظہ متغیر ہوتی ہے جس سے اس کی سابقہ ہیئت میں کچھ تبدیلی آجاتی ہے اور اس سے بعض ارتقاء کے حامی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ارتقاء میں جو شے آج ہے وہ شے کل نہیں رہتی لیکن جو لوگ علم و فراست کے حامل اور روشن افکار رکھنے والے ہوتے ہیں وہ حرکت ارتقائی کے متعلق وہی نظریہ رکھتے ہیں جیسے کہ اس شخص کے متعلق آپ نے پڑھا کہ وہ ایک بچہ کو مسلسل دیکھا کرتا ہے حتیٰ کہ وہ بوڑھا بھی ہوجائے تو اس شخص کے نزدیک اجنبی نہیں ہوتا۔

اس لئے میں انسان کے لئے آسمانی مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کی ضرورت کا قائل ہوں خصوصاً" اسلام کا۔ اس لئے کہ اسلام مذاہب کی۔ ارتقائی حرکت کی آخری کڑی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان ذہنی طور پر ایک بچے

کی طرح تھا تو اسے مذہب بھی اس کی ذہنی استعداد کے مطابق دیا گیا اور جتنا جتنا ذہنی طور پر ترقی کرتا گیا مذہب بھی اسی طرح دیا جاتا رہا مگر آنحضرت صلعم کے زمانے میں انسانی ذہن اپنی بھرپور جوانی تک پہنچ گیا تھا اور ضروری تھا کہ اسے مذہب ایک مکمل دین کی صورت میں دے دیا جائے جیسے کہ بچے کو باپ کی میراث بالغ اور جوان ہونے کے بعد دی جاتی ہے چنانچہ اس عالم کی ارتقائی حرکت خصوصاً" ذہنی ارتقاء کی حالت میں مذہب سے بڑھ کر اچھا نظریہ کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ مذہب کے نظریات غیر متبدل ہیں اور ذہنی ارتقاء میں ہر آن تبدیلیاں ہو رہی ہیں چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ سائنس دان نے مذہب کا مضحکہ اڑایا اور کہا کہ "دیکھو جی، قرآن تو کہتا ہے کہ سورج اپنے مستقر کی طرف رواں دواں ہے مگر سورج تو اپنی جگہ قائم ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے" چنانچہ ان جیسے مکشوفات سے کمزور ذہن مسلمان شک میں پڑ گئے مگر اب وہی سائنس کہتی ہے کہ سورج بھی ایک دوسرے شمسی نظام کا سیارہ ہے اور اپنے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے چنانچہ اسی طرح کئی ایک نظریات معرض ظہور میں آئے اور ختم ہوگئے چنانچہ کشش ثقل کے موجودہ تصور کی غلطی پر میں نے اپنی کتاب تسخیر کائنات میں جو پشتو میں ہے کافی روشنی ڈالی ہے اور سائنس دان بھی اب کشش ثقل کے پرانے نظریہ پر شک کرنے لگے ہیں اس لئے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف آسمانی کتابوں کے نظریات ہی میں یقین رکھے اور اس میں اطمینان اور امن ہے چنانچہ مشہور فلسفی ولیم جیمس نے مذہب کی افادیت پر ایک مکمل کتاب لکھی ہے جس کا نچوڑ یہ ہے کہ اگر مذہب پر پورا پورا عمل کیا جائے تو دنیا میں امن و سکون قائم ہوگا اور نوع بشر بے انتہا ترقیوں سے ہمکنار ہوگی۔

سوال 8:- آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب:- ساتویں سوال میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔

سوال 9:- آپ نے شاعری کے علاوہ دوسری کن اصناف میں طبع آزمائی کی

ہے اور کیوں؟

جواب :- میں نے شاعری کے علاوہ ڈراما ' افسانہ ' کہانی اور مضمون نویسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے وجہ ظاہر ہے کہ فطری رجحان ہی اس طرف تھا مزید برآں یہ ضروری نہیں کہ شاعر ادیب بھی ہو اور نظم کے علاوہ نثر پر بھی قدرت رکھ سکے۔ مگر میں نے نظم و نثر ہر دو میں کامیاب کوشش کی ہے چنانچہ کئی دوستوں نے میری نثر کو بھی شاعری سے عبارت کہا ہے چنانچہ سب سے پہلے 1937ء میں کتاب "تجلیات محمدیہ" لکھی جو نثر میں تھی حالانکہ اس وقت میرا شعری ذخیرہ بہت ہی تھوڑا تھا اور کسی طرح کتابی صورت میں آنے کے قابل نہ تھا پھر وقتاً" فوقتاً" ریڈیو کے لئے جو ڈرامے لکھے ان میں صرف دو ڈرامے نظم میں تھے ایک "ڈمانو خار" (میراثیوں کا شہر) اور دوسرا "میمونہ" البتہ ایک ڈرامے "سوہنی مہینوال" کا اردو سے پشتو نظم میں ترجمہ کرچکا ہوں اور ڈرامہ خوبصورت بلا کو بھی اردو سے پشتو میں منتقل کرچکا ہوں جسے ذوالفقار علی بخاری مرحوم نے جو ڈائریکٹر جنرل تھے ملاحظہ کیا تو حیران رہ گئے اور مجھے طلب کیا جب میں حاضر ہوا تو کہنے لگے "حمزہ صاحب آپ کے ترجمے میں چند مکالمات ایسے بھی ہیں جو ڈراما خوبصورت بلا کی موجودہ شائع شدہ کتاب میں نہیں ہیں" میں نے کہا کہ بجا فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے جب پہلی بار غالباً" 23-1922ء میں سٹیج ڈراما "یہودی کی لڑکی" دیکھا تو حد سے زیادہ متاثر ہوا گویا چراغ سے چراغ جل اٹھا میری استعداد بالفعل ہونے کے لئے تڑپ اٹھی اور پھر میں مسلسل سٹیج ڈرامے دیکھنے لگا ' ہارڈینگ تھیٹریکل کمپنی کے بعد البرٹ کمپنی اور اس طرح مختلف کمپنیوں کے ڈرامے دیکھے پھر میں کتابی صورت میں آنے والے ڈراموں کا مطالعہ کرنے لگا ' چونکہ حافظہ بہت اچھا تھا اس لئے اکثر و بیشتر مکالمات حفظ ہونے لگے اور چونکہ میں ڈراما "نور اسلام" اور "خوبصورت بلا" سے بہت متاثر ہوا تھا اور پھر ڈرامہ "سفید خون" نے بھی متاثر کیا تھا اس لئے میں نے ان شائع شدہ کتابوں کو خرید کر مطالعہ کیا چنانچہ خوبصورت بلا میں اور نیا سویرا

اور تکمیلی تجلی کے اکثر مکالمات موجودہ نسخوں میں نہیں پائے جاتے اور چونکہ مجھے یاد تھے اس لئے اپنی طرف سے لکھ دیئے۔

میری تحریروں میں چونکہ میرے فطری رجحان کے مطابق فلسفہ اور تصوف کا زیادہ تر امتزاج ہوا کرتا ہے اس لئے میری تمام نظم و نثر میں یہی دو مضامین سب سے زیادہ ہیں گو میں نے خالص رومانی نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی کسی حد تک ایسی لکھیں جو تصوف کی ترجمان نہ تھیں - افسانے کم ہی لکھے ہیں - پشتو "لیلیٰ مجنوں" کے مکالمے جو میں نے بمبئی میں 1941ء کے آخر میں لکھے تھے ' زیادہ تر آغا حشر مرحوم کی تحریروں سے متاثر تھے یعنی کسی حد تک مقفیٰ و مسجع عبارت میں تھے اس کا مسودہ میرے پاس محفوظ ہے مگر بعد میں میں نے اس طرز تحریر کو ترک کردیا

میں نے صرف ایک ناول لکھا ہے "نوے چپے" (نئی موجیں) جو دسویں جماعت کے نصاب میں بھی شامل ہوگیا تھا مگر بعد میں خدا جانے کس نے اس پر مخالفانہ رپورٹ لکھ دی جسے صدر ایوب خان کی حکومت نے ضبط کرلیا مگر ابھی ماضی قریب میں نیپ (NAP) حکومت نے اس پر سے پابندی اٹھالی ہے اور قدرت اللہ شہاب جس وقت صدر ایوب کے پی اے ہوتے تھے تو انہوں نے اس ناول میں چند ترمیمات کرکے مجھے پیش کیں میں نے وہ ترمیمات منظور کرلیں اور امید تھی کہ ناول کو واگزار کرا دیا جائے گا مگر اس کے باوجود بھی واگزار نہ ہوا۔

اس ناول کا مرکزی تصور جناب ثمین جان خان مرحوم سابق وزیر تعلیم صوبہ سرحد نے دیا تھا اور ناول بھی انہی کے نام سے منسوب ہے میں نے جب 1944ء میں اس ناول کی ابتداء کی تو لکھا ہوا حصہ جاکر سناتا ثمین جان خان بے حد مسرور ہوتے ' چنانچہ ایک دن میں ایک واقعہ سنا رہا تھا اور چند خواتین بھی بیٹھے تھے جو ملاقات کے لئے آئے تھے ثمین جان خان سنتے سنتے مسکرا اٹھتے جب میں ختم کرچکا تو خواتین کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے ، "آپ نے سنا تاؤ یہ نثر کیسی

ہے" سب نے بے حد تعریف کی، شین جان خان نے کہا "لاؤ روپے کہ اسے چھاپ
دیں" یہ سننا تھا کہ خوانین نے سر جھکا دیئے اور کوئی جواب نہیں دیا۔

غرض میری تمام کتابوں میں آپ کو قومیت و اسلام کا امتزاج ملے گا اور
وہ اس لئے کہ شاعر و ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس وقت
پختونوں کی حالت سیاسی طور پر بے حد ناگفتہ بہ تھی، برادران وطن ان کے حقوق
پر بے دھڑک ڈاکے مار رہے تھے، خصوصاً "ایک یونٹ کے بعد تو حالات ہی ایسے
ہوگئے کہ پختون قومیت پر لکھنا ضروری ہوگیا اور برادران وطن بار بار اسلام کا
مقدس نام آگے لاتے تھے، گویا وہ خود بڑے پکے مسلمان ہوں حالانکہ عملی طور پر
انہیں اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور انہیں بخوبی معلوم تھا کہ پختون ہمیشہ
اسلام کے نام پر فریب کھاتے آئے ہیں، لہٰذا حالات ایسے تھے کہ قومیت کا جذبہ
انتہائی شدت اختیار کرگیا جس کی وجہ سے جماعت اسلامی کے چند دوستوں سے
تصادم واقع ہوا میرا موقف یہ تھا کہ اسلام کسی قومیت کو ختم نہیں کرتا بلکہ ہر قوم
کو اپنے نظام اجتماعی میں زندہ رکھتا ہے بشرطیکہ قومیت کے اصول اسلام کے اصول
سے متصادم نہ ہوں کیونکہ اسلام دین فطرت ہے اور وہ ہرگز فطری رجحان کو نہیں
مٹاتا بلکہ اسے اعتدال میں رکھنے کی ہدایت کرتا ہے اس لئے جہاں تک ان کی قومی
روایات و اقدار کا تعلق ہے جو اسلام کے خلاف نہیں میں انہیں عین اسلام سمجھتا
ہوں، بلکہ پختون ولی (پختون قومیت) اور اسلام ایک ہی تصویر کے دو پہلو ہیں
کیونکہ پختون قوم کی روایات اور اقدار اسی فیصد اسلام کے مطابق ہیں مگر جب
اس پر بھی مخالفین نے پیچھا نہیں چھوڑا اور تفریط کرنے لگے تو میں نے بھی اعتدال
ترک کرکے افراط کے ہتھیار اٹھائے اور اب میرا دعویٰ یہ تھا کہ پہلی شے قومیت
ہے اور مذہب قومیت کا خادم ہے چنانچہ اس پر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا لیکن میں
نے پامردی سے اس طوفان کا مقابلہ کیا۔

میرے دلائل یہ تھے کہ مذہب سے قومیت سابق ہے ہم پختون جب آتش

پرست اور بعد میں بدھ پرست اور پھر مسلمان ہوگئے تو ہر حال میں پختون ہی تھے
اور خدانخواستہ اب کچھ اور ہو جائیں تو تب بھی ہم پختون ہی رہیں گے اور قرآن
حکیم کی جو آیت آپ قومیت کی نفی میں پیش کر رہے ہیں وہی آیت قومیت کی تائید
کر رہی ہے آیت کا ترجمہ یہ ہے "اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک نر اور ایک مادہ
سے پیدا کیا پھر فرمایا تمہیں شعوب اور قبائل میں تقسیم کیا تو بے شک تم میں سب
سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے"

میں نے کہا کہ خدا نے سب سے پہلے فرمایا ہے اے لوگو! چنانچہ میں
ارشاد خداوندی کے مطابق سب سے پیشتر ایک انسان ہوں اور پھر فرمایا تمہیں
شعوب و قبائل میں تقسیم کیا اس لحاظ سے میں پختون ہوں اور آخر میں سب سے
بہتر متقی کو فرمایا گیا تو میں مسلمان ہوں، گویا میں تیسرے درجے میں مسلمان ہوں پھر
خدا نے اپنی کتاب میں جن امور سے منع فرمایا ہے اور جن امور کے عمل میں
لانے کی ہدایت کی ہے وہ تمام امور انسانی معاشرہ کے اندر موجود تھے خدا نے کوئی
ایسا حکم نہیں دیا جو انسانی معاشرہ میں سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ صرف اتنی بات
تھی کہ انسانوں نے افراط و تفریط اختیار کی تھی اور خدا نے انہیں اعتدال اختیار
کرنے کی ہدایت کی لہٰذا ان معنوں میں مذہب اقوام کا خادم ہے اور یہ حقیقت ہے
کہ مجھ پر قومیت کا غلبہ ہو جاتا تو اسلامی جذبہ کمزور پڑ جاتا اور اسلامی جذبہ بڑھتا تو
قومی جذبہ دب جاتا مگر آخر ہر دو ایسے ممزوج ہوگئے کہ اب اس میں کوئی غیریت
محسوس نہیں ہوتی اور وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ میں نے پڑھا تھا کہ آنحضرت صلعم
نے ہاشم اور قریش ہونے پر فخر فرمایا ہے تمام صحابہ اپنے نام کے ساتھ ہی ساتھ
قومیت کا بھی اظہار کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر قومیت کا بطور خاص خیال رکھتے تھے
انہوں نے کسی عرب کو غلام بنانے کی مخالفت کی تھی ان کو تمام عرب کے شجرہ نسب
یاد تھے وہ کسی غیر عرب کو مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ میں عمر بھر کے لئے قیام کو منع
فرماتے تھے چنانچہ نسب کی حفاظت بھی دین سے متعلق ہے اس لئے نکاح میں کفو کا

حکم دیا گیا: ہے اور پھر پختون ولی تو جیسے کہا گیا اسلام کے دوسرے پہلو کا نام ہے اس لئے ہم اسلام اور پختون قومیت میں کوئی غیریت اور اختلاف محسوس نہیں کرتے اور پھر میں نے اور جناب سمندر خان صاحب سمندر نے اپنی نظموں میں کئی بار اللہ تعالیٰ کو پختون کہہ کر مخاطب کیا ہے کیونکہ پختون فطرتاً "غیور ہوتا ہے اور حق تعالیٰ سب سے بڑھ کر غیور ہے۔

سوال نمبر 10:- کیا آپ کے خیال میں کوئی لکھنے والا ہر جہت اور ہر صنف میں طبع آزمائی کرکے بھٹک تو نہیں جاتا؟

جواب:- جن فلاسفہ کا یہ خیال ہے کہ انسان تمام علوم و فنون سے خالی شیشے کی مانند پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی شخصیت، مزاج، ضمیر اپنے ماحول کے قالب میں ڈھل کر تیار ہوتا ہے وہ غلطی پر ہیں چنانچہ علامہ اقبال مرحوم بھی ابتداء میں اس خیال سے متاثر ہوئے تھے اور فرمایا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت ہے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور اس خیال کی غلطی کو اب سائنس اور فلسفے نے بھی تسلیم کرلیا ہے چنانچہ اس خیال پر سب سے پہلے یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ آنحضرتؐ بھی تو ایک مشرکانہ اور گرے ہوئے اخلاق کے ماحول میں پل کر جوان ہوئے تھے پھر آپ اس پر قادر کیسے ہوسکے کہ تمام ماحول کی کایا پلٹ دی اور سب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا چنانچہ اور دنیا کو تو چھوڑیئے سوویت یونین میں بھی بچوں کو رجحان کو نوٹ کیا جاتا ہے اور تعلیم کے بعد جو رجحان غالب ہو اسی کی مناسبت سے اسے ذمہ داریوں کا حامل سمجھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے مولانائے رومی کو کہنا پڑا تھا

ہر کسے را بہرے کارے ساختند
میل او اندر دلش انداختند

چونکہ عالم مادیت میں گوناگوں حالات سے انسان کا سابقہ پڑتا ہے اور

یہاں نوع بشر کو بکثرت مختلف ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے اس لئے خدا نے انسان کو بھی تنوع پسند پیدا کیا پھر ہر انسان کی فطرت میں ایک خاص کام کا رجحان پیدا کیا، گو اس کی فطرت میں مختلف رجحان ہوتے ہیں مگر ایک رجحان بالکل بنیادی حیثیت کا ہوتا ہے گویا وہ اس کی شخصیت کا محور ہوتا ہے لہٰذا تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ انسان تین قسم کا ہے اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ چنانچہ افلاطون نے بھی اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ اعلیٰ انسانوں کے اخلاق اوسط درجے کے انسانوں کی سمجھ سے بھی بالاتر ہوتے ہیں چہ جائیکہ ادنیٰ درجہ کے انسانوں سے۔ اعلیٰ انسان صرف وہی ہے جو علوم و فنون کے لحاظ سے اجتماعیت کا ترجمان ہوتا ہے جسے نابغہ یا جینس (genius) کہا جاتا ہے اسی گروہ میں پیغمبر، مصلح، حکیم اور فلاسفر پیدا ہوتے ہیں جو بالقوہ تمام علوم و فنون کے حامل ہوتے ہیں ان کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ کسی یونیورسٹی کے طالب علم رہے ہوں وہ اگر ظاہری علوم حاصل بھی کرلیں تو مزید بہتر ہوتا ہے چنانچہ فطری رجحان کے زیر اثر وہ ہر علم و فن کو حاصل کرلیتے ہیں لیکن اپنے غالب رجحان سے بھٹکنے نہیں پاتے وہ جس علم، فن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں آسانی سے حاصل کرلیتے ہیں چنانچہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ روس کے مشہور عالم جناب موسیٰ جار اللہ جن کا ذکر ہوچکا ہے جب پشاور شہر میں نظر بند تھے تو چند ماہ بعد ہی پشتو اور اردو سیکھ گئے تھے علامہ سید جمال الدین افغانی کو جب فرانس کے صدر نے ملاقات کی دعوت دی تو آپ نے اس سے چند دنوں کی مہلت طلب کی اور ان چند دنوں میں فرنچ سیکھ کر ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تھے اس کے بعد اوسط درجے کے انسانوں کا نمبر آتا ہے چنانچہ اس قبیل کے انسانوں میں بھی جینس پیدا ہوتے ہیں مگر ان کی عبقریت اعلیٰ درجہ کے انسانوں سے کم ہی ہوتی ہے گویا وہ ایک حیثیت سے اعلیٰ انسانوں کے زمرہ میں بھی آتے ہیں اور اوسط درجے کے انسانوں میں بھی شامل ہوتے ہیں چنانچہ اس ضمن میں نواب خوشحال خان خٹک کی شخصیت ہمارے سامنے ہے وہ خود فرماتے ہیں کہ کتب میں

انہوں نے کوئی خاص علم حاصل نہیں کیا بلکہ نوجوانی میں بھی ہمیشہ شکار و تفریح میں مشغول رہا کرتے تھے لیکن ان کی شخصیت کا اندازہ کرتے ہوئے حیرت ہوتی ہے وہ ایک ہی وقت میں عالم دین، حکیم و فلسفی، نجومی، جغرافیہ دان، شکاری جانوروں کی تربیت کے ماہر، شاعر، ادیب، طبیب اور سب سے بڑھ کر سپہ سالار اور صاحب شمشیر تھے مگر اس کے باوجود وہ راہ سے بھٹک نہ سکے اور جس علم و فن پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کردیا ان کی وہ کتاب جس کا نام "دستار نامہ" ہے ان کے genius کا بہترین ثبوت ہے اس کتاب کا پہلا صفحہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

چہ دستار تڑی بسیار دی
و دستار سڑی پہ شمار دی

(یعنی جو دستار باندھتے ہیں یا جنہیں خانی و ملکی کی دستار بندھوائی جاتی ہے وہ تو بکثرت ہیں مگر جو حقیقت میں دستار کے قابل ہوں وہ معدودے چند ہی ہوتے ہیں)

چنانچہ انہوں نے یہ کتاب قید خانے میں لکھی اور لکھا کہ چونکہ میرے پاس یہاں مطالعہ کے لئے کوئی کتاب موجود نہیں اس لئے میں اپنی یادداشت اور حافظہ کی مدد ہی سے لکھ رہا ہوں اور پھر انہوں نے بیس ایسی صفات کا ذکر کیا ہے کہ یہ صفات جس انسان میں موجود ہوں گی وہ دستار کے قابل شمار ہوگا اور پھر ہر صفت کے عنوان کے تحت اس کی وضاحت کی ہے اور عجیب و غریب علوم و فنون کا مظاہرہ کیا ہے۔ (اردو کے قارئین دستار نامے کا اردو ترجمہ جو خاطر غزنوی نے کیا ہے اور پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی نے شائع کیا ہے مطالعہ فرمائیں)

اور اب ادنیٰ درجے کے انسانوں کے متعلق عرض ہے کہ ان میں بھی علوم و فنون کی استعداد ہوتی ہے مگر ایک خاص علم و فن یا ہنر کا رجحان ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ دوسرے علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوجائیں تو مرکزی رجحان دھندلا پڑ جاتا ہے اور اگر وہ جلد تر اس کی طرف پھر سے متوجہ نہ ہوں تو وہ بھی دھندلا پڑ جاتا ہے اور دیگر علوم و فنون کے حصول میں بھی ٹھوکریں کھانے لگتے ہیں چنانچہ اس

گروپ میں بعض کسب گر بھی شامل ہیں اگر ایک بڑھئی جس کا فطری رجحان بھی اسی طرف ہو کسی مجبوری سے لوہاری کا کام شروع کرے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک عرصے تک پریشان رہے گا اسی طرح دوسرے صنعتی امور کا حال بھی ہے اور ہم فطرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں کہ شہد کی مکھی کا جو کام ہے وہ بھڑ کا نہیں حالانکہ چھتے تو دونوں بناتی ہیں اسی طرح بیل کا کام گدھے اور خچر سے جدا ہے اور یہ تمام حیوانات اپنی صورت نوعیہ کے تحت کام کرتے ہیں مگر انسان چونکہ ارتقاء کی سب سے زیادہ ترقی کرنے والی اور افضل کڑی ہے اور اجتماعیت کا حامل ہے اس لئے ایک نوع ہونے اور صورت نوعیہ کے فیضان کے باوجود بھی رجحان کے سلسلے میں ایک دوسرے سے مختلف ہے اور یہی راز ہے خلافت الہیہ کے اٹھانے کا۔ اگر انسان بھی دوسرے حیوانات کی طرح صرف ایک ہی رجحان کا حامل ہوتا تو دوسرے حیوانات سے کسی طرح افضل و اشرف نہ ہوتا اور نظام عالم کے سلسلے میں وہ ہرگز کارآمد ثابت نہ ہوتا چنانچہ نوع بشر میں ادنیٰ مرتبہ کے انسانوں کی فطری حالت "تقریباً" دوسرے حیوانوں کی سی ہوتی ہے کہ وہ صرف ایک ہی کام بحسن و خوبی کرسکتے ہیں اور اگر متعدد کاموں کی طرف متوجہ ہوں تو بھٹک جاتے ہیں چنانچہ اس کی مثالیں میرے سامنے ہیں اور وہ یہ کہ چند ادنیٰ قسم کے پشتو شاعروں نے جب میری شہرت محسوس کی اور انہوں نے یہ بھی سنا کہ میں نہایت مشکل کہا کرتا ہوں تو وہ بھی مشکل کہنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام مہمل ہو کر رہ گیا۔ گویا شوق پرواز تو ہر پرندہ میں ہوا کرتا ہے مگر شرط قوی بازوؤں کا ہے اس لئے اگرچہ چڑیا اڑنے میں کبوتر کی ریس کرے تو ناکام ہوجاتی ہے بلکہ اکثر ہلاک ہوجاتی ہے۔

سوال 19:- آپ کے مذہبی عقائد کیا ہیں اور کیوں ہیں؟

جواب:- میں مسلمان ہوں تمام ان اسلامی فرقوں کو مسلمان سمجھتا ہوں جو اصول اسلامیہ کی مخالفت نہیں کرتے البتہ خود فرقہ پرستی سے شدید نفرت ہے کیونکہ قرآن حکیم نے اس کی مخالفت فرمائی ہے اور صاف طور پر فرمایا ہے "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور متفرق نہ ہو جاؤ" اور یہی فرقہ پرستی ہی تھی جس نے مسلمانوں کو پریشان اور کمزور کردیا اور بقول قرآن "ان کی ہوا اکھڑ گئی" چنانچہ امام غزالی کے اس قول سے متفق ہوں کہ حقیقت تک رسائی صرف تصوف کے ذریعے ہی ممکن ہے چنانچہ ذوق دہلوی اس کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ہفتاد و دو طریق حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

ظاہر ہے کہ ابجد کی رو سے حسد کے اعداد بہتر (72) ہوتے ہیں اور یقیناً" مختلف فرقے بغض و حسد کی وجہ سے ہی معرض ظہور میں آتے ہیں چنانچہ سنی اور شیعہ وہ پہلے فرقے ہیں جن کے اندر آج بھی بغض و حسد کی آگ روشن ہے میرا عقیدہ ہے کہ حق ان تمام اسلامی فرقوں میں موجود ہے مگر کلی طور پر کوئی فرقہ بھی حق پر نہیں، چنانچہ جو صوفی مشرب ہو گا وہ آزاد ذہن سے سوچے گا اور تمام فرقوں میں سے جو حق ہے اس پر کاربند رہے گا اور میرا عقیدہ ہے کہ جو صوفی کسی خاص فرقے سے متعلق ہو گا وہ یقیناً" صراط مستقیم سے بھٹک جائے گا کیونکہ سلوک کے دوران سالک پر ایسے ایسے اسرار بھی منکشف ہوا کرتے ہیں جو کسی فرقے سے یا اکثر فرقوں سے متصادم ہوتے ہیں چنانچہ وہ اسرار اگر ایک صوفی کے متعلقہ فرقے کے عقائد کے خلاف ہوں تو اب اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ ہو گا کہ یا تو اپنے فرقے کو چھوڑ دے اور یا تصوف کو خیرباد کہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اسرار کے ظاہر کرنے کی وجہ سے ان فرقوں کے علماء نے اکثر صوفیوں سے کفر

و زندقہ منسوب کیا اور ہمیشہ سے ان کے درمیان اختلافات چلے آرہے ہیں اور یہی ایک واضح وجہ ہے کہ جناب شیخ احمد سرہندی نے صرف اپنے ہی پیران سلسلہ کے متعلق نہیں بلکہ دوسرے سلسلوں کے اولیاء کو بھی شرک سے منسوب کیا کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ حق صرف فرقہ اہل سنت و الجماعت میں مخصوص ہے اور جو اس فرقہ سے تعلق نہیں رکھتا وہ گمراہ ہے اور یہ کہ صوفیوں سے مقابلہ میں علمائے ظاہر حق پر ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان علماء کی شدید مخالفت بھی کی ہے اور انہیں حقیقت کی منزل اول سے بھی محروم فرمایا ہے چنانچہ اس کے متعلق میری کتاب "وجود و شہود" میں سیر حاصل تبصرہ موجود ہے اسی طرح ابن تیمیہ اور چند دوسرے علماء نے شیخ اکبر محی الدین ابن العربی سے کفر و زندقہ منسوب کیا، مگر امام عبدالوہاب شعرانی اور چند دیگر علماء نے شیخ اکبر کی حمایت میں کتابیں لکھیں اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں آج کل جتنے مسلمان موجود ہیں ان کا وجود صرف صوفیائے کرام کی تبلیغ کا ہی مرہون منت ہے علماء نے اکثر مسلمانوں کو تو کافر و زندیق بنایا مگر ایک بھی غیر مسلم کو مسلمان نہ بنا سکے اور یہی حال حضرت شیخ احمد سرہندی کا تھا کہ انہوں نے شیعہ سنی سوال کو ہوا دی اور تبلیغ کے سلسلہ میں کسی غیر مسلم کو متاثر نہیں کیا اور نہ ہی آپ نے براہ راست شہنشاہ اکبر و جہانگیر کو ان کی بدعتوں اور خلاف اسلام امور پر متنبہ کیا بلکہ جہانگیر کے بڑے بڑے افسروں کو خطوط لکھے اور ہدایت کی کہ وہ بادشاہ کو سمجھا دیا کریں اور جب جہانگیر نے انہیں نظر بند کردیا تو بقول جہانگیر (تزک جہانگیری) تائب ہو گئے اور انہیں بادشاہ کی طرف سے ایک ہزار روپے خرچ بھی دیا گیا اور اپنے پاس ہی رکھا تاکہ کوئی طوفان کھڑا نہ کر سکیں اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت شیخ نے اسلام کی ترویج میں معتدبہ حصہ لیا لیکن آپ وہ شاندار کارنامہ نہ دکھا سکے جو حضرت خواجہ معین الدین، قطب الدین اور محبوب الٰہی نظام الدین نے تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں کر دکھایا تھا تو معلوم ہوا کہ حضرت شیخ عالم زیادہ تھے اور صوفی کم۔

پھر علمائے اہلسنت و الجماعت نے ابتداء ہی سے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ وہ اہل بیت نبوی کے مقابلہ میں صحابہ کو افضل قرار دیتے ہیں ٹھیک ہے کہ یہ رد عمل ہے فرقہ امامیہ کے بعض افراط عقائد کا۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ اگر ایک انسان گناہ کرتا ہے تو دوسرا بھی اس کا جواب گناہ سے دے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ جو انسان رسول کریمؐ کی گود میں پل کر جوان ہوا، آنحضرت صلعم نے خود ان کی تربیت فرمائی اور ان کے متعلق فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ علیؓ ہرگز ہرگز شرک و گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ ہوگا جن کے متعلق ابن عباسؓ نے صراحت کی ہے کہ "ہم منافقوں کو بغض علی کی وجہ سے پہچانا کرتے تھے" اور کتاب نور الابصار مطبوعہ مصر میں جناب فاطمہ بنت اسد والدہ حضرت علیؓ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ "جب میں بیت الحرام میں طواف کے بعد چاہتی کہ بتوں یا حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی تصاویر کے آگے جھک جاؤں تو علی جو اس وقت میرے شکم میں تھے میرے شکم میں پیر پھیلا دیتے جس سے میں اس قابل نہ رہتی کہ غیر اللہ کے سامنے جھک سکوں۔" گویا حضرت علی شکم مادر ہی میں ہادی تھے اور آپ پیدائشی مسلمان ہیں۔ لیکن وہ صحابہ جو کئی سال بت پرستی کرتے رہے اور بعد میں ایمان لے آئے وہ حضرت علی سے افضل کیسے ہوسکتے ہیں اور اگر افضلیت کا معیار علم کو قرار دیا جائے اور حقیقت بھی یہی ہے تو حضرت علی علم میں سب صحابہ سے بڑھ کر تھے اور تصوف کے تمام سلسلے انہی کی طرف راجع ہیں صرف شیخ احمد سرہندی نے اپنا سلسلہ حضرت علیؓ سے کاٹ کر حضرت ابوبکر سے ملایا۔ حالانکہ خود لکھتے ہیں کہ "ہاں ہمارے بعض اکابر سلسلہ نقشبندیہ بھی حضرت امیر سے ملایا کرتے تھے مگر میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اسے حضرت ابوبکرؓ تک منتہی کروں چنانچہ خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی نے لکھا ہے کہ "ہمارا سلسلہ بھی حضرت علیؓ تک منتہی ہوتا ہے حضرت ابوبکر سے ہماری نسبت اویسی ہے" اور شیخ احمد سرہندی صاحب نے لکھا ہے کہ "جو فرقہ اہلسنت و الجماعت سے منسلک نہیں وہ گمراہ ہے اور جو حضرت ابوبکر رضی اللہ

عنہ کو بعد رسول تمام امت سے افضل نہ سمجھے وہ فرقہ اہلسنت سے خارج ہے" تو صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں سے فوق اسلامیہ کے مابین بغض و حسد کے علاوہ اور کیا پیدا ہوسکتا ہے اور شیعوں نے بھی اصحاب ثلاثہ کی شان میں وہ کچھ کہا جسے افراط ہی کہا جاسکتا ہے اور حضرت علیؓ نے جو ان کے ساتھ تعاون کیا اسے تقیہ پر محمول سمجھتے ہیں گویا وہ اسد اللہ الغالب جو ہزاروں کفار کا مقابلہ کیا کرتے تھے جو کرار و غیر فرار تھے انہوں نے ناحق سے تعاون کیا۔ بہرحال حضرت علیؓ کا ان سے تعاون اس قدر تو ثابت ہی کرتا ہے کہ آپ اصحاب ثلاثہ کو غیر مسلم ہرگز نہیں سمجھتے تھے البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ چند امور میں حضرت علی انہیں غلطی پر سمجھتے ہوں پھر عجیب بات تو یہ ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی حضرت عثمانؓ سے اس قدر الفت تھی کہ اکثر لوگ انہیں عثمانی کہا کرتے تھے اور شہادت عثمان کے موقع پر آپ اور آپ کے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام نے حضرت عثمانؓ کے محل کا دروازہ مصری خروجیوں پر بند کر رکھا تھا اور اس ہنگامہ کے دوران زخمی بھی ہوگئے تھے چنانچہ بعد میں شیعہ اور سنی مذہبی عقائد سے بڑھ کر سیاسی عقائد کے پیرو ہوگئے اور شیعوں نے کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفیقوں کے غم میں ماتم کا جو طریقہ اختیار کیا وہ امیر معاویہ کی سنت سے عبارت ہے کیونکہ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت عثمان کی خون آلود قمیض اور ان کی زوجہ کی کٹی ہوئی انگلیاں جامع دمشق میں آویزاں کی گئی تھیں شامیوں کا ایک گروہ اس پر ماتم کرنے کے لئے مقرر کردیا گیا تھا اور ماتم کرنے کے دوران دہائی دیتے کہ یہ علی کی کرتوت کا نتیجہ ہے اور شیعہ اس پر بھی ناراض ہوگئے کہ اہل سنت و الجماعت نے سنت شیخین سے زیادہ سنت معاویہ پر عمل کرنا شروع کردیا چنانچہ اب اہل سنت و الجماعت میں جب کوئی پیر صاحب مرنے لگتا ہے تو اپنے بیٹے کو جانشین کرتا ہے گو اس سلسلے میں وہ آنحضرت صلعم کا جائز اور پہلا جانشین حضرت علی کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ [illegible] مرشد آنحضرت صلعم کا خلیفہ اور جانشین

ہوتا ہے تو پھر اگر نبیؐ کی کوئی میراث نہیں ہوتی اور نبیؐ نے اپنا جانشین بھی نامزد
نہیں کیا تو یہ پیر صاحبان ایسا کیوں کرتے ہیں امیر معاویہ کا وزن جب بہت بڑھ گیا
تھا تو وہ خطبہ کے دوران بیٹھ جاتے تھے اور پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے - اہل
سنت بھی اسی کی سنت جاری رکھے ہوئے ہیں امیر معاویہ نے اس خوف کی وجہ سے
کہ نماز کے دوران انہیں قتل نہ کیا جائے مسجد میں بڑی محراب بنائی تھی اور پھر
اس پر لوہے کا جنگلا بنا دیا تھا اور اس کے اندر محفوظ ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے
چنانچہ اب بھی اہل سنت کی مسجدوں کی محرابوں کا وہی نقشہ ہے اور حیرت اس بات
کی ہے کہ اگر کوئی حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ پر اعتراض کریں جو عشرہ مبشرہ میں شامل
تھے تو یہ لوگ اس قدر ناراض نہیں ہوتے جس قدر کہ امیر معاویہ کے خلاف
اعتراض سن کر ہوتے ہیں حتیٰ کہ یزید جیسے شخص کو بھی مومن قرار دیتے ہیں جس
نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے باپ کی سب سے
زیادہ خوبصورت لونڈی کو اپنے حرم میں داخل کیا اور جنگ صفین میں جب حضرت
عمار بن یاسر شہید ہو گئے اور لوگوں نے امیر معاویہ سے جا کر کہا کہ آنحضرت صلعم
نے حضرت عمار سے فرمایا تھا کہ "تجھے باغی گروہ قتل کرے گا" تو امیر معاویہ حدیث
کی تردید تو نہ کر سکے کیونکہ سینکڑوں صحابہ کو یہ حدیث یاد تھی مگر کہنے لگے "اسے علی
نے قتل کیا ہے اگر وہ اسے میدان میں نہ لے آتے تو قتل نہ ہوتے" فرمایئے جب
آنحضرت صلعم کے ارشادات سے یہ برتاؤ کیا جائے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ
مخلص مسلمان ہو گا، پھر ایسے علما کا کردار موجب حیرت ہے کہ تاریخ میں تو صاف
طور سے موجود ہے کہ بنی امیہ اور بنو ہاشم کے مابین ابتداء ہی سے دشمنی چلی آ رہی
ہے اور واقعہ کربلا کے بعد بھی جاری رہی - کیا نفسیاتی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ
جب بنی امیہ کسی طور پر بھی بنی ہاشم پر غالب نہ آ سکے تو بظاہر مسلمان بن کر اپنے
اقتدار کی تاک میں رہے اور جب اقتدار ہاتھ آگیا تو اپنا پرانا بدلہ چکا سکے جیسے کہ
یزید کے اشعار سے مترشح ہے جب کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک

اس کے سامنے رکھا تھا اور یزید کہتا تھا "اے کاش اگر ہمارے وہ بزرگ موجود
ہوتے جو بدر کی لڑائی میں شہید ہو گئے تھے تو اب کہہ دیتے کہ یزید تیرے ہاتھ شل
نہ ہوں تم نے خوب ہی انتقام لیا -"

ایک دن سیدو شریف میں سابق والئی سوات عبدالحق جہانزیب کا مہمان
تھا چونکہ سکول میں ایک عرصہ تک ساتھ رہے تھے اس لئے میں کبھی کبھی ان کے
ہاں چلا جاتا کبھی کبھی خط لکھ کر بلاتے شام کا وقت تھا اور میں کمرے میں اکیلا تھا کہ
مہمان خانہ کے منتظم نے آکر کہا کہ "ایک مہمان آگیا ہے وہ آپ کے ساتھ رہے یا
علیحدہ کمرہ دیا جائے" میں نے پوچھا کہ "مہمان کون ہے" جواب دیا "محمد اکبر خادم"
میں نے خوش ہو کر کہا کہ "وہ میرے ساتھ ہی رہیں" چنانچہ خادم صاحب تشریف
لائے - بڑی گرما گرم شعر و شاعری کا معرکہ برپا ہوا بعد میں میں نے ان سے کہا کہ
خادم صاحب ایک بات بتایئے مگر بتانے سے قبل یہ اقرار کیجئے کہ آپ اپنے ضمیر
کے مطابق سچ ہی کہیں گے" فرمایا "سچ کہوں گا" میں نے کہا کہ آنحضرت صلعم کی
وفات کے بعد خلافت کے سلسلے میں حقدار کون تھا - یہ سنتے ہی گھبرا گئے فرمایا حمزہ
صاحب کیا آپ علماء کے ذریعے میری بے عزتی کرانے پر تل گئے ہیں؟ میں نے کہا
کہ "خادم صاحب آپ تو منہ پر حق بات کہنے والے ہیں قید و بند کی صعوبت
برداشت کر چکے ہیں آپ اب حق بات کہتے ہوئے جھجکتے کیوں ہیں -" فرمایا "اچھا
لیکن تم بھی یہ اقرار کرو کہ میری زندگی تک کسی سے نہ کہو گے -" میں نے کہا "وعدہ
کرتا ہوں کسی سے نہ کہوں گا" فرمایا اگر لوگ حضرت علی کو خلیفہ منتخب کرتے
تو حق تھا اور اگر حضرت علی خلیفہ ہوتے تو مسلمانوں میں موجودہ فرقے بھی معرض
ظہور میں نہ آتے -"

چنانچہ ان اسباب کی وجہ سے میرا عقیدہ وہی ہے جو اکثر و بیشتر صوفیاء کا
ہے یعنی اہل بیت نبوی کی افضلیت کا قائل ہوں اور صحابہ سے حسن ظن رکھتا ہوں
البتہ جن صحابہ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کو غلطیاں ہی منسوب کرتا ہوں اور

ان سے جو جو واقعات معرض ظہور میں آئے ہیں ان کی وجہ سے انہیں، عدول بھی
نہیں سمجھتا جیسے کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ صحابہ سب کے سب عدول تھے یہ
واقعہ کے خلاف ہے اگر صحابہ کا مطلب صرف یہ ہو کہ وہ آنحضرت صلعم کی صحبت
میں رہے یا کبھی کبھار ملتے رہے اور تھے بھی مسلمان اور اس کے باوجود بھی انہوں
نے جو غلطیاں کیں انہیں غلطیاں نہ سمجھنا چاہئے تو میں ایسے عقیدہ کو رد کرتا ہوں
کیونکہ یہ لوگ حضرت علیؓ اور امامین میں کو تو معصوم نہیں سمجھتے پھر صحابہ کیونکر
معصوم عن الخطا ہو سکتے کیا وہ صحابہ نہیں تھے کہ ایک دن جبکہ آنحضرت صلعم نماز
پڑھا رہے تھے تو بازاروں میں سے منادی کی آواز سن کر چند صحابہ نماز چھوڑ کر
تماشہ دیکھنے باہر چلے گئے کیا وہ بھی صحابہ نہیں تھے جن میں سے ایک نے مال غنیمت
تقسیم کرتے وقت کہا تھا "محمد انصاف کرو" اور بار بار یہی کہتا رہا، حتیٰ کہ آنحضرت
غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ "تیری ماں مرجائے اگر میں ہی انصاف نہ کروں گا تو
اور کون کرے گا" کیا عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ وغیرہ صحابہ نہیں تھے اور کیا
انہوں نے رشوت لے کر حضرت علی کے مقابلہ میں امیر معاویہ کی حمایت نہیں کی
تھی۔ کیا تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ جب امیر معاویہ نے عمرو بن العاص کو اپنی حمایت
کی دعوت دی تو اس نے کہا تھا کہ "معاویہ! کہاں تم اور کہاں علی، کہاں علی کی
شخصیت اور کہاں تمہاری شخصیت کیا مسلمان علی کے مقابلہ میں تمہاری حمایت
کریں گے" معاویہ نے کہا کہ ان باتوں کو چھوڑ دو اپنا مدعا صاف صاف بتاؤ۔ عمرو
بن العاص نے کہا کہ جب میں حق کے مقابلہ میں باطل کا ساتھ دیتا ہوں تو معتدبہ
معاوضہ لئے بغیر کیسے ساتھ دے سکتا ہوں" معاویہ نے کہا "کیا مانگتے ہو" جواب دیا
"مصر کی حکومت" معاویہ نے کہا "اب مصر میرے تحت ہی کہاں" عمرو بن العاص
نے کہا "جب مصر فتح ہو جائے تب اس کی حکومت دے دیجئے" معاویہ نے مان لیا
اور مصر کی حکومت دینے کا اقرار نامہ لکھ کر دے دیا۔

اب بتایئے کیا عمرو بن العاص بھی صحابہ کلھم عدول میں شامل ہے اور

مغیرہ بن شعبہ بھی کہ جب اسے معلوم ہوا کہ معاویہ اسے معزول کرنے کا ارادہ
رکھتا ہے تو اسے یزید کو جانشین بنانے کا مشورہ دیا اور خوشامد کر کے اپنے عہدے کو
بچایا اسی مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کے لئے زیاد بن ابیہ کو حضرت علی سے منقطع
کرویا چنانچہ مغیرہ بن شعبہ نے جاکر زیاد سے کہا کہ "تم امیر معاویہ کے بھائی ہو"
اس نے متعجب ہو کر کہا "یہ کیونکر" مغیرہ نے کہا "ابوسفیان نے اپنے بیٹے معاویہ کو
وصیت کی ہے کہ اس کے تعلقات آپ کی والدہ ابیہ سے رہے ہیں اور آپ
ابوسفیان کے بیٹے ہیں" چنانچہ زیاد حضرت علی کو چھوڑ کر معاویہ سے مل گیا تو اب
آپ ہی انصاف کیجئے ایسے لوگ عدول ہو سکتے ہیں اور کیا میں اس وجہ سے انہیں
عدول مان لوں کہ نہ ماننے کی صورت میں علمائے اہلسنت مجھے رافضی یا خدا جانے
کیا کیا کہیں گے، لہٰذا وہ جو چاہیں مجھے سمجھ لیں ہرگز ہرگز ایسے مسلمانوں کو عدول
نہ سمجھوں گا کیونکہ دین میں افراط و تفریط نہیں ہے اور بمصداق حدیث شریف میں
اعتدال اور خیر الامور اوسطہا کا قائل ہوں میرا عقیدہ عدل اور اوسط پر قائم ہے
میں دین کے سلسلے میں سب سے پیشتر ان لوگوں کے اقوال و افعال کو چراغ راہ
سمجھوں گا جن کے گھر میں وحی نازل ہوئی اور ان کے بعد دیگر صحابہ خصوصاً" ان
صحابہ کے اقوال و افعال کو پسند کروں جو حقیقت میں عدول تھے اور یہی میرا عقیدہ
ہے چنانچہ میرے اس خیال کی تائید ایک صحیح حدیث سے بھی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ
آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میں آخرت میں اپنے چند صحابہ کو دوزخ میں دیکھ کر اللہ
تعالیٰ سے سوال کروں گا کہ یہ تو میرے صحابہ تھے ارشاد باری ہو گا، ہاں تیرے
صحابہ تھے مگر تیری وفات کے بعد تیرے دین پر قائم نہ رہ سکے۔

اب فرمایئے کیا وہ بھی عدول سمجھے جائیں گے اور اگر نہیں اور یقیناً"
نہیں تو پھر یہ اصول ہی خود ساختہ ہے پھر تمام علماء کے ہاں یہ مسلم ہے کہ آنحضرت
صلعم کے بعد لوگوں نے ہزاروں جھوٹی احادیث بنائیں اس لئے محدثین نے مجبور ہو
کر صحت حدیث کے سلسلے میں دوسرے نظریات کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری

سمجھا کہ حدیث عقل کے خلاف ہو تو اسے رد کر دینا چاہئے چنانچہ یہ نظریہ صحابہ کرام
عدول بھی عقل کے خلاف ہے گویا امیر معاویہ حضرت علیؓ سے باغی ہوئے تو بھی
عدول اور حضرت علی نے اس پر فوج کشی کی تو بھی عدول - جنگ صفین میں ہزاروں
مسلمان مارے گئے تو سب شہید - قاتل بھی شہید اور مقتول بھی شہید جنگ جمل میں
تقریباً" اٹھارہ ہزار مسلمان تہ تیغ ہو گئے تو اس نظریے کے ماننے والوں نے کہا کہ
"قاتل و مقتول ہر دو مقبول" واہ سبحان اللہ ' ہاں میں یہ ضرور تسلیم کرتا کہ صحابہ
عدول تھے مگر تمام کے تمام نہیں چنانچہ مسلمانوں کے افتراق و تشتت کے بعد ہر
فرقے نے اپنے عقائد کی صداقت جتانے کے لئے جھوٹی حدیثیں وضع کیں شیعوں
نے بھی اور سنیوں نے بھی - چنانچہ اس ضمن میں جہاں صحیح احادیث سامنے آئیں
مخالف فرقے نے ان کے مقابلہ میں دوسری احادیث پیش کیں اور بعد میں حالات
نے ایسا رخ اختیار کیا کہ کئی ایک فرقے معرض ظہور میں آئے اور تا حال بنتے چلے
جا رہے ہیں - ہو سکتا ہے کہ میرے خیالات کو بھی ایک علیحدہ فرقے کی تخلیق کی
کوشش سمجھ لیا جائے - اور اب تمام فرقوں کے مسلمان چلا رہے ہیں کہ اتحاد بین
المسلمین کیوں نہیں - میں کہتا - ہوں کہ قیامت تک یہ اتحاد ممکن نہیں البتہ اگر
حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کی پیش گوئی صحیح ہو ' جسے سنی اور شیعہ ہر دو
ایک نہ ایک رنگ میں تسلیم کرلیں تو پھر یہ امید بندھ سکتی ہے کہ ان کے ظہور کے
بعد یہ افتراق ختم ہو جائے گا مگر دوسرے مذاہب والے بھی اب تک کسی آنے
والے کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے ہیں مگر آنے والے نہ آئے - اب دیکھنا یہ
ہے کہ حضرت امام مہدی بھی کبھی ظہور فرمائیں گے یا ہمارا حال بھی دیگر مذاہب
والوں کا سا رہے گا - چنانچہ انہی اسباب کی وجہ سے میرا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام کی
روح صرف تصوف کی رو سے ہی حاصل ہوتی ہے اور تصوف کے صرف ان
سلسلوں سے جو حضرت علی تک منتہی ہوتے ہیں -

سوال 12 :- تصوف کی طرف آپ کیوں آئے تصوف کی چاشنی کیا چیز
ہے - آپ تصوف کے کس پہلو کے معتقد ہیں؟

جواب :- گیارہویں سوال کے جواب میں واضح ہو چکا ہے کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ
اسلام کی صحیح روح تصوف ہی میں حاصل ہو سکتی ہے اب رہی یہ بات کہ میں
تصوف میں کیوں آیا - تو اس کا جواب صاف ہے کہ لکل فن رجال - اللہ تعالیٰ نے
ہر فن کے لئے علیحدہ انسان تخلیق کئے ہیں اور بقول مولانا رومی ان فنون کا شوق
بھی ان کی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں خود تصوف میں
نہیں آیا ' لایا گیا ہوں اور وہ یہ کہ انسان کی فطرت میں اپنے مرکزی اور محوری
فطری رجحان کے علاوہ دیگر رجحانات بھی ہوتے ہیں اور وہ ابتدائے عمر خصوصاً" عالم
شباب میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا البتہ وہ حضرات جو تصوف کی راہ دشوار گزار
کے شہسوار رہے ہوں اور جنہوں نے اپنے نفس کی معرفت کے بعد حق تعالیٰ کی
معرفت کا شرف پایا ہو وہ مردم شناسی میں بہت بڑی دسترس رکھتے ہیں وہ ایسے
انسانوں کو ایک ہی نظر میں دیکھ کر پہچان لیتے ہیں جن کی سرشت میں تصوف و
سلوک کی چاشنی موجود ہو - چنانچہ وہ اپنی توجہ سے انہیں دوسرے اشغال سے کاٹ
کر اپنی راہ پر لے آتے ہیں لیکن بعض انسان فطرتاً" باغی طبیعت کے ہوتے ہیں
اس لئے ان کو گھیر لانے میں بڑی محنت کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک گھوڑا بھی
جب تانگے میں جوتنے کے لئے سدھایا جاتا ہے کس قدر مشکل سے قابو میں آتا ہے
پھر انسان کی بات ہی اور ہے چنانچہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور میرے شیخ نے
خوف کی اتحادی توجہ دی جس کا اثر یہ ہوا کہ میں ہر وقت موت کے خوف سے
لرزاں و ترساں رہا اور حالت یہ ہوئی کہ ابتداء میں میرا وزن دو من تین سیر تھا
چند برسوں میں ایک من دس سیر رہ گیا پھر حالت یہ ہوئی کہ ایک فرلانگ پیدل
نہیں چل سکتا تھا پھر بھی اندرونی بغاوت موجود تھی حتیٰ کہ پھر شیخ کی طرف سے
خوف کے ساتھ ہی ساتھ محبت کی توجہ بھی محسوس ہونے لگی اور ان کے ساتھ ہی

کچھ مکاشفات بھی ہوئے چنانچہ طبیعت اس طرف راغب ہونے لگی اور بغاوت کا جذبہ بھی سرد ہونے لگا چنانچہ ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ عین لڑکپن میں بھی کبھی امیر المومنین یعسوب المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ کو خواب میں دیکھا کرتا تھا محرم کے دنوں میں ہمارے ہاں قبائلی علاقے میں پشتو جنگ نامے پڑھے جاتے تھے میں سنتا تو بے اختیار رونے لگتا یوں حضرت امام حسین علیہ السلام سے بے پناہ محبت بڑھتی گئی چنانچہ جب جوانی میں مجھ پر الحاد کا دورہ پڑا تو باور کیجئے میں خدا کی ہستی کا قائل نہ رہا تھا مگر جہاں حضرت امام مظلوم کا ذکر آتا میرے دل میں حق تعالیٰ کا تصور ابھرنے لگتا اور میرا دل یقین کرلیتا کہ اگر ذات باری کی ہستی موجود نہ ہوتی اور حضرت امام کو اس کا پکا یقین نہ ہوتا تو ہرگز اس قسم کی قربانی پیش نہ کرتے بلکہ یزید کی بیعت کرکے عیش و عشرت سے بسر کرتے چنانچہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا یقین اگر ایک انسان کو حاصل ہو سکتا ہے تو حسب فطرت و استعداد ہر انسان کو بھی حاصل ہو سکتا ہے پھر الحاد اور بے یقینی میں جس قدر پریشانی اور ہر نوع اصول سے فرار اور تلون ہے اور اس سے تو بہرحال تھوڑا سا یقین بھی بہتر ہے۔

تو گویا چراغ میں تیل موجود تھا صرف اسے دیا سلائی کی ضرورت تھی اور اسے میرے شیخ نے روشن کردیا اور اب رہی یہ بات کہ تصوف کی چاشنی کیا ہے تو اس راہ میں مجھے جو چاشنی کسی حد نصیب ہوتی ہے تو اس کا الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں البتہ اشارہ ہو سکتا ہے مثلاً" جس وقت یادداشت (حق تعالیٰ کا تصور) حاصل ہو اور ساتھ ہی رجا اور صحو کی حالت ہو تو حق تعالیٰ کی محبت جو اس وقت ظاہر ہوتی ہے اور وہ کیفیت جو وارد ہوتی ہے کسی طور بیان نہیں کی جا سکتی صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی تمام خواہشیں ناپید ہو جاتی ہیں موت سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور سالک کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس قسم کی قید سے جلد تر آزاد ہو کر عالم روحانی سے منسلک ہو جائے کسی قسم کا خوف، طمع، لالچ غرضیکہ کوئی خواہش باقی نہیں رہتی پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس حال میں عجیب و غریب اسرار کا انکشاف ہوا

کرتا ہے اور ہر انکشاف پر دل میں مسرت و اطمینان کی روشنی پیدا ہوتی ہے چنانچہ جب میں کبھی حضرت عنایت علی شاہ ضیاء جعفری مرحوم سے بعض کیفیات کا اظہار کرتا تو فرماتے "آپ کے خیالات کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزرے" جناب مرزا نذیر برلاس صاحب سنتے تو فرماتے "یونانی فلسفہ یہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جس قدر نفسیاتی علوم ایک صوفی کو حاصل ہوا کرتے ہیں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتے وجہ یہ ہے کہ صوفی کا کام ہی احتساب نفس ہوتا ہے وہ ہر خواہش کا تجزیہ کرتا ہے اور اس کی علت تلاش کرتا ہے اور جب تک اس کی علت معلوم نہیں ہوتی اور پھر اس کا دفعیہ نہیں ڈھونڈ لیتا اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نفس انسانی کے اکثر و بیشتر محرکات کو سمجھ لیتا ہے اور پھر صحیح اور غیر صحیح مکاشفہ کا فرق بھی جان لیتا ہے چنانچہ اس کے متعلق مختصر عرض کروں گا کیونکہ مفصل لکھنا چاہوں تو علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی حقیقت تو یہ ہے کہ انسان حیوانیت و ملکیت کے مابین ہے وہ جب بہ حیثیت روح مجرد عالم ارواح میں تھا اس وقت علم الاشیاء مجرد طور اس کے اندر مندرج تھا **وعلم الاشیاء کلھا** سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کو تمام اشیاء کا علم دیا گیا اور وہ اس کی اولاد میں منتقل ہو کر آیا، چنانچہ انسان کی روح جب عالم امر سے عالم مثال کی طرف منتقل ہوگئی تو اس کے مجرد علوم سے امثلہ نے مل کر اسے بڑی حد تک بالفعل بنایا اور پھر شکم مادر میں نزول کے بعد جب نو ماہ تک رہا تو اپنی ماں کے ذریعے عالم مادی یا عالم ناسوت کے اثرات اخذ کئے تاکہ پیدا ہونے کے بعد عالم مادیت کے اثرات اسے بے کار نہ کردیں اور یہی شکم مادر اس کے لئے برزخ تھا چنانچہ عالم ارواح سے عالم مثال میں آتے وقت بھی ایک برزخی حال سے دوچار ہونا پڑا تاکہ مثال کے حالات و کیفیات کے لئے تیار ہو سکے چنانچہ عالم مادیت میں اسے مادی حواس بھی مل گئے اور اب علم الاشیاء میں مزید ترقی کرنے کا موقع میسر ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ تنزل ذات باری سے روح کو ہوا کیونکہ وجود باری میں ہر شے عین وجود باری تھی ہر

شے کا ایک اسم تھا اور صفت تھی جس پر اس کی تخلیق ہوئی تھی اور اس کا ایک "عین" تھا چنانچہ اعیان کا نظریہ افلاطون نے بھی پیش کیا ہے اور صوفیائے اسلام نے بھی۔

اب اس نزول یا ارتقاء کے دوران جس قدر ترقی روح نے کی اسی قدر ان اشیاء نے بھی اپنی انفرادیت تک پہنچنے میں ترقی کی اور ہر مرحلہ پر اشیاء کی ہیئت میں تبدیلی آتی گئی چنانچہ ڈارون تھیوری کے دانشوروں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ ارتقاء کے دوران جو شے آج ہے کل وہ نہیں رہے گی حالانکہ جو اشیاء اس وقت ہمارے سامنے ہیں وہ ترقی کرکے اس صورت تک پہنچی ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور اب انسان حواس سہ گانہ کا حامل ہے عقلی یعنی روحانی، مثالی اور مادی، اس طرح اس کے شعور کے بھی تین ہی مدراج ہیں گو اکثر ماہرین نفسیات دو کے قائل ہیں یعنی لاشعور اور شعور یا تحت الشعور اور لاشعور۔ مگر میرا اپنا مشاہدہ یہ ہے کہ انسان کے مدارج شعور تین ہیں شعور یا فوق الشعور، تحت الشعور اور لاشعور۔ تحت الشعور فوق الشعور اور لاشعور کے مابین برزخ کی حیثیت رکھتا ہے ہم جو سنتے اور دیکھتے ہیں فعلی و انفعالی سے سابقہ پڑتا ہے یہ تمام فوق الشعور میں شامل ہوجاتے ہیں اور جتنا جتنا عرصہ گزرتا ہے فوق الشعور سے وہ تمام تحت الشعور میں اترتے جاتے ہیں مزید عرصہ گزرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ لاشعور میں منتقل ہوتے ہیں اور یہی لاشعور انسان کی بنیادی شخصیت سے عبارت ہے۔ لاشعور ایک انسان کی اپنی مخصوص انفرادیت یعنی "عین" کا ترجمان ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی عادات و اخلاق کا بھی حامل ہوتا ہے جو قانون توارث کے تحت اس کے لاشعور میں جاداخل ہوتا ہے اور پھر اس کا تجزیہ بے حد مشکل بلکہ ناممکن سا ہوتا ہے اور اس انسان کی کسی عادت کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس کے اپنے "عین" سے عبارت ہے یا آباؤ اجداد سے منتقل ہو کر آئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسانی تربیت انسان کا سب سے مشکل فریضہ

ہے اور ہر انسان کی صورت میں ان کے والدین کے نقوش بھی ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود اس کی اپنی بنیادی صورت بھی ہوتی ہے جو والدین کے نقوش کی پرچھائیں ہوتی ہے چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ کی ملاقات پہلی بار ایک شخص سے ہو تو ردعمل کے نتیجہ میں یا تو آپ اس کو پسند کریں گے یا ناپسند اور یا یہ ہوگا کہ نہ پسند ہوگا نہ ناپسند۔ یہ فیصلہ لاشعور کا ہوا کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ باہمی تعلقات کی وجہ سے کبھی کبھی لاشعور کے اس پہلے فیصلے میں ترمیم بھی کرنی پڑتی ہے یعنی ناپسند کچھ کچھ پسند اور گوارا ہوتا جاتا ہے اور جو پسند اور گوارا تھا وہ ناپسند اور غیر گوارا ہوتا جاتا ہے اس کی وجہ لاشعور کی کم فہمی اور غلطیاں نہیں ہوتیں بلکہ فوق الشعور کا کام ہوتا ہے کیونکہ لاشعور پر فوق الشعور کا غلبہ ہوا کرتا ہے کیونکہ ہماری تمام ضروریات کا اندازہ فوق الشعور ہی کا کام ہے جو ہمارے سامنے ہوتا ہے اس لئے لاشعور کا فیصلہ دب جاتا ہے مثلاً" پہلی ملاقات میں لاشعور نے زید کو پسند نہیں کیا تھا مگر چند ملاقاتوں کے بعد معلوم ہوا کہ آپ کی چند ضروریات کا وہ کفیل ہوسکتا ہے یا آپ کی چند خامیوں کا ازالہ کرسکتا ہے آپ فوراً" اسے پسند کرنے لگیں گے اسی طرح پسند کا بھی حال ہے کہ لاشعور نے تو پسند کیا تھا مگر فوق الشعور نے محسوس کیا کہ آپ کی راہ میں حائل ہے یا آپ کی مرضی کے خلاف چل رہا ہے تو اب ناپسند ہونے لگا چنانچہ ظاہر ہے کہ مخصوص صحبت اور مطالعہ سے ایک انسان ملحد بن جاتا ہے یہ فیصلہ فوق الشعور کرتا ہے پھر یہ ملحدانہ خیالات تحت الشعور میں اترتے ہیں اور جب تحت الشعور میں ان کا نقش جم جاتا ہے تو پھر وہ لاشعور کے سامنے پیش ہوتے ہیں کیونکہ جس قدر تحت الشعور میں نقوش پختہ ہوجاتے ہیں ان پر مزید نقوش فوق الشعور سے پڑتے جاتے ہیں چنانچہ ایک عرصے گزرنے کے بعد وہ نئے نقوش سے دب جاتے ہیں اور وہ انسان کی بنیادی شخصیت یعنی لاشعور میں ملنے کے لئے بڑھتے ہیں مگر اب اگر اس انسان کا لاشعور مذہبی ہو تو ان ملحدانہ نقوش اور لاشعور کے مابین شدید تصادم شروع ہوجاتا ہے اور انسان پریشانی اور ذہنی

اختلال میں مبتلا ہو جاتا ہے نتیجہ کے طور پر اگر لاشعور پختہ اور مستحکم مذہبی احساس
رکھتا ہو تو ملحدانہ نقوش ختم ہو کر رہ جاتے ہیں ورنہ دوسری حالت میں لاشعور
انہیں قبول کرلیتا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں کسی انسان کا لاشعور ذات
باری کا منکر نہیں ہے کیونکہ انسان کے فطری تقاضوں کا جواب ہی تصور باری ہے
اور اس لئے افلاطون کا خیال تھا کہ کوئی انسان چالیس برس کی عمر کے بعد ملحد نہیں
رہ سکتا چاہے وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے مثلاً" ہمارے زمانے کے مشہور ملحد
حضرت نیاز فتح پوری مرحوم نے موت سے قبل اعلان کیا تھا کہ وہ سنی مسلمان ہیں
اور مرنے کے بعد اہلسنت والجماعت کے عقائد کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کی
جائے اسی طرح شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی ایک عرصہ سے میدان الحاد
سے رجعت فرما چکے مگر انہوں نے اس کے اظہار کو اپنے وقار کا سوال بنا لیا ہے
میں خود ان سے گفتگو کر چکا ہوں اور میں نے محسوس کیا کہ وہ الحاد سے مکمل طور پر
رجعت کر چکے ہیں اور پھر ایک پختون، اور پختون بھی آفریدی پختون ہمیشہ کے لئے
ملحد کیسے رہ سکتا ہے کم از کم بارہ تیرہ سو برس سے ان کے آباؤ اجداد کے اخلاق کیا
اس کے لاشعور میں منتقل ہو کر نہ آئے ہوں گے؟ یقیناً" آئے ہوں گے۔

اب آتے ہیں حقائق اشیاء کی طرف چنانچہ صوفی کہتے ہیں **اللھم ارنا
الاشیاء کماھی** یعنی اے خدا ہمیں اشیاء ایسی ہی دکھا جیسی کہ حقیقت میں ہیں فلسفی
کا کام بھی حقائق اشیاء کا انکشاف ہے۔ اس سلسلے میں میری معلومات کا جو تعلق ہے
وہ مختصرا" پیش کرتا ہے۔

انسانی شعور میں عالم عقل عالم مثال اور پھر عالم شہادت تک اشیاء کو جو
ارتقاء ہوتا ہے اس کی صورت ایک مسلسل زنجیر کی کڑیوں کی سی ہے اور یہ زنجیر ہر
حال میں سوتے جاگتے محو حرکت ہے چنانچہ جس شے کی کڑی ذہن انسانی کے سامنے
آتی ہے وہ شے حافظہ پر ابھر آتی ہے یہ سلسلہ جیسے بیداری میں جاری رہتا ہے اسی
طرح نیند کے عالم میں بھی جاری رہتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ بیداری میں

اشیاء کی ان کڑیوں سے خیال پیدا ہوتا ہے اور نیند کی حالت میں وہ اشیاء متشکل ہو
کر نظر آتی ہے اب اس سلسلہ میں قوت تذکر تو ملاحظہ فرمائیے، آپ ایک دوست کا
نام بھول جاتے ہیں قوت حافظہ پر زور دیتے ہیں مگر وہ یاد نہیں آتا لیکن جب آپ
دوسری طرف مشغول ہو جاتے ہیں تو پھر یکایک وہ نام یاد آجاتا ہے فرمائیے اس کا
سبب کیا ہے چنانچہ بڑے بڑے دانشور اور حکیم بھی اس سلسلے میں حیران رہے ہیں
امام فخرالدین رازی نے کہا کہ جب مجھ سے ایک دوست کا نام بھول جاتا ہے اور
میں قوت تذکر اور حافظہ پر زور دیتا ہوں تو یاد نہیں آتا پھر جیسے ہی خود بخود ہی کہیں
سے آجاتا ہے حیران ہوں کہ اگر وہ نام میرے حافظے میں تھا تو تلاش کی ضرورت
ہی کیا تھی فورا" لے لیتا، اور اگر حافظے میں نہ تھا تو میری تلاش فضول تھی مگر اب
حیرت ہے کہ وہ کہاں سے آگیا چنانچہ امریکہ کی ایک مشہور ماہر نفسیات ہیلن کی
ایک کتاب کا اردو ترجمہ میری نظر سے گزرا ہے ہیلن بھی اس سوال تک پہنچی تھی
مگر تجزیہ کرتے کرتے راہ میں بھٹک گئی اور صحیح حل پیش نہ کر سکی سو اگر وہ اور
دیگر دانشور اس راز سے واقف ہوتے کہ اشیاء ایک زنجیر کی کڑیوں کی مانند ہر آن
ہمارے ذہن پر پر تو ڈالتی ہوئی گزرتی ہیں تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس وقت اشیاء
کا جو سلسلہ ذہن کے سامنے سے گزر رہا ہے اس میں اس کے دوست کے نام کی
کڑی موجود نہیں ہے یا تو بہت آگے گزر چکی ہے اور یا بہت دور ہے اور صوفی کا
چونکہ یہی کام ہوتا ہے اس لئے وہ ہر وقت اس سلسلہ کو مد نظر رکھتا ہے کیونکہ انہی
نقوش کا تعلق مختلف خواہشات سے ہوتا ہے اور انسان کے ذہن پر ہر آن کائنات
کے مختلف پر تو پڑتے رہتے ہیں چنانچہ کشف کا فلسفہ بھی یہیں حل ہو جاتا ہے اور وہ
یوں کہ صوفی کو اپنے خیالات کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے جیسے کہ ایک طالب علم کو اگر
کل پرچہ امتحان حل کرنا ہے تو اس کے خیالات کی تمام کڑیاں یکے بعد دیگرے اس
پرچہ امتحان سے متعلق ہوں گی تو اگر ان خیالات کے دوران کوئی ایسا خیال
آجائے جس کا تعلق بالکل امتحان سے نہ ہو تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ خیال خارج

سے وارد ہوا ہے اور یہی کشف کا فلسفہ ہے نفسیات کے سلسلے میں فرائیڈ کو بانی سمجھا جاتا ہے لیکن چونکہ اس کے نظریات الحاد کے زیر اثر مرتب ہوئے ہیں اس لئے وہ حقیقت تک نہ پہنچ سکا۔ انسان کو صرف ایک مادی جانور کے لحاظ سے دیکھ کر اس کی شخصیت کا پرکھنا ہرگز کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا اس طرح فرائیڈ اور ان جیسے دیگر مادئین نے جب روح کا انکار کیا اور روح کو صرف جسم انسانی اور اس کے اعضاء قوی کے متحدہ عمل سے عبارت سمجھا تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی تحقیقات بالکل سرسری اور نامکمل رہیں کیونکہ انسان کو جو خواب نظر آتے ہیں انہیں یہ مادیین صرف انسانی خیالات کی پیداوار سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں انہیں مادیت کے فلسفہ سے ہم آہنگ کرنے کے لئے عجیب و غریب تعبیرات سے کام لیتے ہیں مثلاً" ایک انسان خواب کے دوران فضاء میں پرواز کرتا ہے ان مادیین کے خیال میں چونکہ وہ عالم بیداری میں مختلف پرندوں یا ہوائی جہازوں کو اڑتے دیکھ چکا ہوتا ہے اس لئے وہ خواب میں اپنے آپ کو اڑتا محسوس کرتا ہے کیونکہ انسان اگر بیداری میں کسی شے کا مشاہدہ نہ کر سکے تو خواب میں بھی نہیں کر سکتا مثلاً" پیدائشی اندھا کوئی صورت خواب میں نہیں دیکھ سکتا یا پیدائشی بہرہ کوئی آواز نہیں سن سکتا مگر یہ فلاسفہ حقیقت تک نہیں پہنچتے ہیں اس ضمن میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک شخص خواب میں پشاور سے لاہور کے لئے پیدل روانہ ہوتا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ لاہور تک پیدل پہنچنے میں مثلاً" دس روز گزر جاتے ہیں اور اسی طرح لاہور سے واپس آنے میں بھی اتنا ہی عرصہ گزر جاتا ہے لہٰذا وہ اپنے سفر کو بیس ہی دن سمجھے گا لیکن ناممکن ہے کہ وہ اسے وہ عرصہ سمجھ سکے جتنے عرصے میں اس نے خواب دیکھا گویا خواب میں مسافر اپنے سفر کی معیاد بیس دن ہی محسوس کرے گا مگر حقیقت میں اس تمام خواب کا وقت چند ثانئے سے زیادہ نہ ہوگا پھر وہ جو کہتے ہیں کہ جو کام انسان بیداری میں نہ کر سکے یا جو شے بیداری میں نہیں دیکھ سکے وہ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا اور دوسری بات یہ ہے کہ انسان جس کام کو

بیداری میں ناممکن سمجھتا ہے وہ ضروری طور پر خواب میں بھی ناممکن ہونی چاہئے کیونکہ ان فلاسفہ کے نزدیک انسان مکمل طور پر ایک مادی جانور ہے لہٰذا اس کے نزدیک حواس بھی یقیناً" مادی ہی ہوں گے اور اس کے حواس بیداری میں جو اندازہ کرتے ہیں وہی خواب میں بھی کریں گے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کوئی انسان بیداری میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اڑ سکتا ہے پھر خواب میں وہ کیوں اپنے آپ کو اڑتا محسوس کرتا ہے کیا اس کے مادی حواس عالم خواب میں تبدیل ہو جاتے ہرگز نہیں بلکہ وہی حواس ہوتے ہیں جو بیداری میں تھے فرق صرف یہ ہے کہ مادئین مثالی حواس کی حقیقت تک نہیں پہنچے ان کی نظر مادی حواس سے بلند ہی نہ ہو سکی لہٰذا وہ معذور ہیں اور ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں مادی حواس غافل بلکہ معطل ہوتے ہیں باصرہ اور سامعہ بالکل اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی جب انسانی "انا" یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ فضا میں اڑی جا رہی ہے تو صاف ثابت ہوا کہ نہ صرف یہ کہ انسانی حقیقت مادی نہیں بلکہ مثالی اور عقلی حواس بھی موجود ہیں پھر یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ مادی حواس تو نیند میں معطل ہیں یہ اپنے آپ کو اڑتا ہوا کون محسوس کرتا ہے پھر جاگنے کے بعد جب مادی حواس کو اس کا علم ہو جاتا ہے تو بتائیے وہ پشاور سے لاہور تک آنے جانے کا کتنا وقت مقرر کرتے ہیں! ظاہر ہے مادی حواس بیس ہی دن کا تعین کرتے ہیں مگر مثالی حواس کے نزدیک وہ چند ہی ثانیوں کا وقت ہوتا ہے کیا وقت کا یہ مختلف احساس صاف ثابت نہیں کرتا کہ انسانی "انا" اور مادی" انا" میں فرق ہے ہر دو کے ادراک و احساس میں فرق ہے اور ہر دو کے بنیادی وجود میں تباین ہے ایک انا تو روحانی اور غیر مادی ہے اور دوسری مادی اور غیر روحانی - چنانچہ اس کے متعلق میری ایک پشتو میں لکھی ہوئی کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ میں انگریزی نہیں جانتا صرف اردو اور کسی قدر فارسی کا مطالعہ ہے اور یہ مطالعہ بھی کامل نہیں کہا جاتا ہے چنانچہ میرے یہ تمام خیالات

تصوف کی راہ ہی میں پیدا ہوئے ہیں اور اب آخر میں آپ کے سوال کی یہ شق
مد نظر ہے کہ میں کس پہلو کو زیادہ پسند کرتا ہوں تو عرض یہ ہے کہ میں وحدۃ الوجود
کا نظریہ پسند کرتا ہوں جو قرآن حکیم کے دعوہ وحدت انسانیہ کا حامی ہے آنحضرت
صلعم نے بھی اپنے آخری خطبہ میں فرمایا تھا "تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی
سے بنائے گئے تھے" ظاہر ہے کہ مادہ بھی ایک وحدۃ الوجود ہے اب عالم مادیت کی
اشیاء پر غور فرمائیے ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں مختلف اشیاء کی علت یہی مادہ ہے
لوہا، تانبا، سونا، انسان، درندے، چرندے، پرندے اور حشرات الارض غرضیکہ
تمام کے تمام اسی ایک مادہ کی پیداوار ہیں اور جسمانی طور پر تمام مساوی ہیں -
صرف علت غائی کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ تانبا اور انسان
ایک وجود سے عبارت نہیں اگر تمام اشیاء کو ہمہ مادہ کہا جائے تو کیا غلط ہے اسی
طرح اگر تمام اشیاء کو ایک وجود احد سے عبارت سمجھا جائے اور کہا جائے کہ ہر
وجود حق تعالیٰ کا یا حق تعالیٰ کے وجود سے عبارت ہے تو کیا حرج ہے کیا ایک وجود
ہونے میں شک ہے البتہ ہندو فلاسفی میں تین قدیم یعنی انادی وجود تسلیم کئے گئے
ہیں پرمیشر (خدا) جیو (روح) پرکرتی (مادہ) اور یہ تینوں قدیم ہیں ان میں سے کسی
نے دوسرے کو پیدا نہیں کیا بلکہ یہ قدیم سے تین متوازی خطوط کی مانند چلے آرہے
ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس ذات میں قوت اور انرجی زیادہ ہو وہ دوسری ذات
پر حکومت کرتا ہے اور چونکہ پرمیشر تو جیو اور پرکرتی سے بڑھ کر صاحب قوت ہے
اس لئے اس نے مادہ اور روح کو مرکب کرکے سرشٹی یعنی کائنات بنائی اور تمام
وجود بھی ان کے اعمال کے مطابق بنائے مگر جب ان سے یہ سوال کیا جائے کہ جب
خدا روح و مادہ کا خالق نہیں اور وہ خود بخود موجود تھے جیسے کہ خدا خود بخود موجود
تھا تو روح و مادہ کو مرکب کرنے کے لئے ایک ابتدا کی ضرورت ہے اس کے لئے
ایک وقت ایسا چاہئے جس سے قبل وہ مرکب نہ ہوں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ
چونکہ خدا روح اور مادہ تینوں قدیم ہیں اس لئے ان کے اعمال بھی قدیم ہیں ہم

ایسی ابتداء مانتے ہی نہیں - اب ایک دانشور بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اگر یہ نظریہ
صحیح ہوتا تو کائنات ہی معرض ظہور میں نہ آتی کیونکہ کوئی شے اپنی وجودی حیثیت
میں تغیر و تبدل کو برداشت نہیں کرسکتی اور ہندوؤں کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ خدا
نے اپنی طاقت و قوت سے روح و مادہ کو مرکب کردیا لہٰذا صاف ظاہر ہوا کہ خدا
کے اس مظاہرہ قوت کا بھی ایک وقت اور ایک ابتداء ماننی پڑے گی ورنہ ہندو
دھرم کا یہ عقیدہ ایک طفلانہ خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا - اس سے تناسخ کا
عقیدہ پیدا ہوا اور چونکہ میرے نزدیک اس وقت ہندو دھرم کے عقائد کا رد نہیں
بلکہ صرف تصوف کے مسئلہ وحدۃ الوجود پر لکھنا تھا جو تصوف کی راہ میں مجھ پر
منکشف ہوا ہے اس لئے اب یہ عرض کروں گا کہ جیسے کہ بعض مسلمان دانشور جو
وحدۃ الوجود کے مخالف ہیں یہ کہتے ہیں کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ ہندو ویدانت سے
عبارت ہے اصل معاملہ نہ سمجھنے کی وجہ سے کہتے ہوں گے کیونکہ ویدانت والے تو
تین مستقل وجود تسلیم کرتے ہیں ایسی حالت میں ایک وجود کا عقیدہ کیسے تسلیم کرسکتے
ہیں اور اگر انہوں نے تسلیم کیا ہے تو اپنے عقائد سے انحراف کے بعد ہی تسلیم کیا
ہے اور میرا خیال ہے کہ موجودہ زمانے کے مزاج کے مطابق ہے اور یہ مکمل
اسلامی نظریہ ہے -

سوال 13:- آپ کی کون سی نمایاں تحریر تصوف کی ترجمانی کرتی ہیں؟

جواب:- میں نے 1937ء میں ایک کتاب تجلیات محمدیہ پشتو میں لکھی تھی جو تمام کی تمام تصوف سے متعلق تھی اور اس کے بعد میں نے جو کتابیں لکھیں ہر ایک میں کسی حد تک تصوف پر لکھا گیا ہے پھر میری نمایاں تحریر تذکرہ ستاریہ ہے جسے میں نے پشتو میں لکھا اور جناب سید طاہر بخاری نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا چونکہ یہ کتاب میرے شیخ حضرت سید عبدالستار شاہ کی وفات کے بعد لکھی گئی اس لئے 1937ء کی تحریروں کے مقابلہ میں کسی قدر بہتر ہے تذکرہ ستاریہ میرے شیخ حضرت کی سوانح حیات پر مشتمل ہے نیز ان کے طرز پرورش اور صوفیانہ افکار سے عبارت ہے یہ تذکرہ چھپ چکا ہے۔

سوال 14:- آپ کا ریڈیو اور ٹی وی کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب:- اچھے ادارے ہیں بشرطیکہ اہلکار اچھے قوم پرور اور قابل ہوں۔ میرا تعلق ریڈیو سے تب سے ہے جبکہ 1935ء میں آل انڈیا ریڈیو کی ایک شاخ (1) کا پشاور میں افتتاح ہوا پہلے آفیسر انچارج محمد اسلم خان خٹک تھے اس کے لئے میں نے پہلا پشتو ڈرامہ زمیندار لکھا تھا اور وہاں سے پہلا ڈراما غالباً "دوینو جام" نشر ہوا تھا جو محمد اسلم خان خٹک کے نام سے شائع ہوا تھا مگر ایک دن جبکہ میں اس وقت کے فاضل اناؤنسر پشتو ادیب و شاعر عبدالکریم مظلوم مرحوم کے ساتھ کھڑا تھا اور ہم سے کچھ فاصلہ پر خٹک صاحب کھڑے کتاب "دوینو جام" ہاتھ میں لئے ہوئے تھے مظلوم صاحب نے آہستہ سے اشارہ کرتے ہوئے فی البدیہہ کہا

واچہ ستا پہ لاس کښې بنکاري دا زما د وینو جام دی

یعنی تیرے ہاتھ میں جو نظر آرہا ہے یہ میرے لہو کا جام ہے اور کہا کہ یہ ڈراما میں نے انہیں لکھ کر دیا ہے واللہ عالم بالصواب۔ میں نے خود بھی ڈراما "دوینو جام" میں سیشن جج کا کردار ادا کیا ہے مظلوم صاحب کے ساتھ مرحوم میاں داؤد شاہ برق

(1) پشاور سٹیشن آل انڈیا ریڈیو کی شاخ نہ تھا بلکہ صوبائی حکومت کا کارنامہ تھا۔ (ناظر)

بھی تھے ہر دو فاروق شاہ اور سمندر خان کے نام سے مکالمہ نشر کیا کرتے تھے اور ہاں میں نے ایک اردو مشاعرے میں بھی حصہ لیا تھا مصرعہ طرح یہ تھا

کونے میں بھی اب بیٹھ کے رویا نہ کریں گے

میرا مطلع یہ تھا

ہم اس بت بے مہر کو رسوا نہ کریں گے
کونے میں بھی اب بیٹھ کے رویا نہ کریں گے

اور بعد میں مرحوم صدر ایوب خان کے زمانے میں ٹی وی کا دور آیا تو اس میں بھی مجھے معتدبہ حصہ دیا گیا مگر ریڈیو اور ٹی وی سے میرا جس قدر تعلق رہا ہے اور آج تک اس کے جتنے اہل کاروں سے تعلق رہا ہے ان کے متعلق میری رائے اچھی نہیں ہے یہ لوگ ایک ادیب شاعر کو پہلے بانس پر چڑھاتے ہیں پھر یکایک اسے نیچے گرا گر کر قعر گمنامی میں پھینک دیتے ہیں اپنے پرانے آرٹسٹوں کا کچھ بھی خیال نہیں رکھتے مثال کے طور پر مستی دولت جو رباب بجانے کے علاوہ پشتو ڈراموں میں بھی کام کرتا تھا سالہا سال سے ریڈیو پشاور سے متعلق رہا مگر جب بوڑھا اور ضعیف ہوگیا سماعت و بصارت سے محروم ہوگیا تو اسے کوئی امداد نہیں دی گئی بعد میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی حکومت نے یا غالباً" ان سے ماقبل کی حکومت نے تھوڑا سا وظیفہ مقرر کرا دیا جو بعد میں بند ہوگیا وہ میرے پاس آیا میں نے اس کے لئے درخواست لکھی اور وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں بھیج دی مگر اس کا کوئی جواب نہ دیا گیا بچارا آخر وقت تک ٹھوکریں کھاتا رہا البتہ ریڈیو اور ٹی وی میں کبھی کبھی کچھ اچھے اور دیانت دار اہل کار بھی آجاتے ہیں مگر شاذ و نادر۔ پھر وہ دیانت دار بھی ہوں تو کیا ان کے ماتحت تو اپنی من مانی کرتے رہتے ہیں اپنے دوستوں کو سرفہرست رکھتے ہیں ان کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ سرکاری نگہ ہے بہرحال چلتا ہے۔ چنانچہ خود مجھے اکثر آٹھ دس ماہ بلکہ سال کے بعد بھی پروگرام نہیں دیا گیا چنانچہ میں بھی وہاں جانا ہرگز پسند نہیں کرتا اور نہ ان کے کسی

اہلکار سے پروگرام نہ دینے کی شکایت کرتا ہوں یہ ایک واقعہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ سجاد سرور نیازی مرحوم پشاور ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے اور اس سٹیشن سے محمد اکرم فاروق شنواری کا ایک ڈراما ان کی اجازت کے بغیر نشر ہوگیا ان کا خیال تھا فاروق اسے نہیں سنیں گے مگر اتفاق سے انہوں نے ڈراما سن لیا مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد ریڈیو والوں سے اس ڈرامے کا عوضانہ پانچ سو روپے طلب کیا جناب اب حالت یہ ہوئی کہ ریڈیو میں بھگدڑ مچ گئی فاروق نے اپنے خط کی ایک کاپی کنٹرولر کی خدمت میں بھی بھیج دی تھی آخر نیازی صاحب نے ہمیں بلایا میں نے جانے سے انکار کردیا مگر نیازی صاحب کے میرے بڑے بھائی ملک باور خان سے دوستانہ تعلقات تھے بھائی نے مجبور کیا تو فاروق کو ساتھ لے کر نیازی صاحب سے ملا - نیازی صاحب نے چھوٹتے ہی کہا تم لوگ بھیک بھی مانگتے ہو اور ڈنڈے کے زور سے مانگتے ہو - مجھے شدید غصہ آگیا جواب دیا تم جیسے میراثی لوگ بھیک مانگتے ہیں ہم پختون بے شک ڈنڈے کے زور سے وصول کرتے ہیں مگر بھیک نہیں اپنا حق مانگتے ہیں اور تم دیکھو ہم کیسے وصول کرتے ہیں اس کے ساتھ چوہدری اقبال صاحب اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی بیٹھے تھے جو بعد میں اس محکمہ کے بڑے افسر بن گئے اور اب شاید فوت ہوچکے ہیں مجھ سے الجھنے لگے میں نے اسے بھی ایک جھاڑ پلائی اور یہ کہتے ہوئے اٹھا کہ یہاں مراثیوں اور طوائفوں کی قدر دانی ہوتی ہے شاعروں اور ادیبوں کو بھیک منگا کہا جاتا ہے چند دنوں بعد پھر بھائی باور خان کے اصرار پر ریڈیو اسٹیشن گئے نیازی نے معافی مانگی اور کہا کہ میں بھی چونکہ نسلاً" پٹھان ہوں اس لئے ذرا دماغ گرم ہوگیا تھا چنانچہ میں نے اکرم فاروق کو ہدایت کی کہ اپنے ڈرامے کی فیس لے کر راضی ہوجائیں چنانچہ راضی نامہ ہوگیا-

سوال 15:- آپ کی پسندیدہ صنف ادب کیا ہے اور کیوں؟

جواب:- میری پسندیدہ صنف ادب غزل ہے گو میں نے نظمیں رباعیات اور

قطعات بھی لکھے ہیں لیکن فطری رجحان غزل کی طرف ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ شاعر کی شاعری کی ابتداء اکثر غزل ہی سے ہوتی ہے لیکن بعد میں اپنے فطری رجحان کے مطابق دوسری صنف میں لکھنے لگتا ہے اس سے اس قدر تو ثابت ہوتا ہے کہ ہر انسان کی فطرت کا رجحان ذوق جمال ہے اور چونکہ غزل تمام اصناف شاعری میں ذوق جمال سے تعلق رکھتی ہے اس لئے ابتداء بھی اس سے ہوتی ہے مگر بعد میں ذوق جمال اپنے معیار حسن سے متاثر ہوکر دوسری صنف میں لکھنے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ حسن ہر صنف میں موجود ہوتا ہے اور یہی تنوع ہے جو انسانی فطرت میں موجود ہے اور اسی سے ادب و شاعری میں مختلف مدارج معرض ظہور میں آتے ہیں انسان جو فطرتاً" تنوع پسند ہے وہ ہرگز ایک ہی صنف میں عمر بھر کے لئے نہیں لکھ سکتا اور اگر لکھنے ہی لگے تو اس کا ادب پس پسا اور بے مقصد ہوکر رہ جاتا ہے چنانچہ ترقی پسند ادب کے زوال کا سبب بھی یہی تھا کہ ادیب اور شاعر چل پھر کر آخر میں ضروریات شکم پر تان توڑتے تھے جس سے انسانی فطرت گھبراتی ہے لیکن ایک صنف غزل میں لکھنے سے ہرگز تنوع پسندی میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ اب غزل صرف چشم و ابرو کی تعریف میں مقید نہیں رہی بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاس ہوگئی ہے پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ خود غزل بھی متنوع افکار سے تعلق رکھتی ہے غزل میں حسن و عشق کے علاوہ انسانی تعصبات، تصوف اور فلسفہ بھی نہایت خوبی سے سمویا جاتا ہے چنانچہ میری غزل میں بھی متنوع افکار اور علوم کی ترجمانی کرتی ہے مثلاً" منطق جیسے خشک علم کے ایک کلیہ **الضدین لایجمعن** کے متعلق میری غزل کا ایک شعر ہے -

د یار رخ او تورے زلفے لکہ شپہ اور ورځ دی یو ځائے
اجتماع وہ د ضدیو ناممکن شو ممکن دا ے

(یعنی میرے محبوب کا رخ زیبا اور زلفیں ایک ہی محل پر اکٹھی ہوگئی ہیں دیکھئے اجتماع ضدین جو ناممکن تھا اس طرح ممکن ہوگیا-)

سب سے پہلے جناب حاجی سمندر خان صاحب نے مجھے غزل کا بادشاہ کہا تھا، 1940ء کے ماہ مارچ میں ایک بار یہ مشاعرہ چوک نمک منڈی میں منعقد ہوا تھا طرح کا مصرع جناب کاظم خان شیدا کے دیوان سے لیا گیا تھا۔

سیاہ مار پہ نظر نہ راځی ماښام دی

(مار سیاہ نظر نہیں آتا شام کی تاریکی ہے)

اور جب میں نے یہ شعر پڑھا

تورے سترگے دے د یار زړه ته په خیر دی
بیا جشو په کعبه تړلے لام دے

(یعنی محبوب کی سیاہ آنکھیں میرے دل پر ضرب لگانے کے لئے اٹھی ہیں پھر ال جش نے کعبہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا ہے)

تو سمندر خان صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا "واہ واہ غزل کے بادشاہ"

بعد میں کسی نے بابائے غزل اور کسی نے شہنشاہ تغزل بنایا، اور شاید یہ لقب اس سبب سے کسی حد تک موزوں و مناسب بھی ہوں کہ میں نے اپنے ہم عصر شعراء میں سب سے زیادہ غزلیں لکھیں چنانچہ اپنی ایک رباعی کا دوسرا شعر یاد آرہا ہے۔

ما دینہ د زړه در کړه د پښتو غزله
ستا شونډه په راشنه شوه خو بابا شومه زه

(یعنی اے پشتو کی غزل میں نے تجھے خون دل پلا کر جوان کیا مگر میں بھی تو بابا بن کے رہا۔)

"بابا" میں ایہام مد نظر اور صنف غزل سے زیادہ لگاؤ کا سبب میرا حد سے زیادہ ذوق جمال بھی ہو سکتا ہے اور معیار حسن کے سلسلے میں بھی جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں کچھ آگے نکل گیا ہوں گویا کسی حد تک ان افراد کے طبقہ میں شمار کیا جا سکتا ہوں جن کا معیار حسن کلیت کا رنگ رکھتا ہو کیونکہ حسن اپنی کلیت میں ذات

مطلق ہی سے عبارت ہے کیونکہ حق تعالیٰ سرچشمہ جمال ہے اور آنحضرت صلعم نے بھی فرمایا ہے کہ خدا جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ موسیقی سے زیادہ لگاؤ کی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ موسیقی میں جو حسن اور دلکشی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

سوال 16:- ادب میں ترقی پسندی کی تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:- اس کے متعلق گزشتہ سوال میں کسی حد تک اپنے خیال کا اظہار کر چکا ہوں بلکہ کسی خاص ادب اور اس ادب کے شائقین کو ترقی پسند کہنا ہی محل نظر ہے کیونکہ کوئی ادیب اپنے ادب کو غیر ترقی پسند خیال نہیں کرتا اور جو لوگ ترقی پسند کہلاتے ہیں وہ کمیونسٹ خیال کے ہوتے ہیں اور اکثر ملحد ہوتے ہیں جو نظریہ ارتقاء کے قائل ہوتے ہیں ان کے خیال میں ارتقاء ایک مشینی عمل ہے بلکہ یوں کہئے کہ ان کے خیال کے مطابق یہ کائنات ہی ایک بے جان مشین کی مانند بغیر کسی مقصد کے رواں دواں ہے تو پھر ترقی کے کیا معنے رہ جاتے ہیں اور علوم و فنون کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور اگر ان کے خیال میں ارتقاء کا کچھ مقصد ہو تو پھر انہیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مقصد کسی ذہن اور شعور کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا حالانکہ وہ کسی ایسے ذہن و شعور کے قائل نہیں جو مادہ سے ماورا ہو لہٰذا کوئی انسان اپنے آپ کو غیر ترقی پسند نہیں سمجھتا اور ایسا خیال کرنا کسی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ رجعت اور تنزل کو بخوشی قبول کرے البتہ رجعت کے بغیر ترقی بھی ناممکن ہے اور رجعت ہی وہ عمل ہے جو حقیقی ارتقاء کی کیفیت متعین کرتی ہے اگر ایک انسان چڑھائی پر چڑھتے چڑھتے ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں سے وہ ایک بے انتہاء اونچائی سے نیچے گرنے والا ہو تو کیا وہ گرنا پسند کرے گا یا رجعت کر کے دوسری آسان راہ کی تلاش میں مصروف ہو گا اگر یہ لوگ ماضی کی اقدار و روایات کو ترک نہ کرنے والے کو رجعت پسند اور غیر مرتقی سمجھتے ہیں تو ان کی نادانی ظاہر

ہے کیونکہ وہ زمانے کی حقیقت سے محض بے خبر ہیں زمانے کی مثال ایک مسلسل
بہتے ہوئے عظیم دریا کی ہے اور اگر ہم دریا کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھیں گے تو
پانی ہماری نظروں کے سامنے سے گزرتا جا رہا ہے اور جسے ہم "حال" سے تعبیر
کرتے ہیں اور پانی کا وہ ریلا جو چشم زدن میں "ماضی" بن جاتا ہے اور جو پانی آ رہا
ہے اسے "مستقبل" سمجھا جائے جو ہمارے پاس پہنچنے کے بعد "حال" اور چشم زدن
میں "ماضی" بن جاتا ہے یہ تو ہمارے ذہن کی اپنی تقسیم ہو گی لیکن دریا کا "مستقبل"
اور "ماضی" اگر بے کار سمجھا جائے تو اس کا "حال" بھی مفقود ہو جائے گا اور چونکہ
ان ترقی پسندوں کا مدعا صرف مذاہب کو ختم کرا دینے اور نوع انسان کو تمام ان
اخلاق کے بندھنوں سے آزاد کرانا ہے جو انسان نے مذہب کے تحت لاکھوں برس
کے ارتقاء کے بعد اختیار کئے ہیں اس لئے وہ معذور ہیں اور غیر شعوری طور پر
نوع بشر کو پتھر کے زمانے کی طرف واپس لے جا رہے ہیں گویا انسان کو پھر سے وحشی
اور ننگا بنانا چاہتے ہیں لیکن وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے انسان کا لاشعور مذہبی ہے
اور ہمیشہ ہی مذاہب کا غلبہ رہے گا۔

سوال 17 :۔ پشتو ادب کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :۔ امید افزا ہے لیکن نہایت شدید اختلاف کا سامنا ہے حالات کے تیور
بتا رہے ہیں کہ پشتو زبان و ادب کی پیش رفت میں روڑے اٹکائے جا رہے ہیں وجہ
کچھ بھی ہو مگر پختون ادباء شعراء کے بار بار کے احتجاج بھی موثر ثابت نہ ہو سکے
کسی زبردست مخفی مخالف نے پشتو کو جکڑ رکھا ہے میں نے اپنی ادبی زندگی کے فروغ
کے لئے جو کوششیں کی ہیں اس کا جواب تو مستقبل ہی دے گا اور پھر ہم سب پشتو
ادباء نے جو متحدہ کوششیں کی ہیں ان کا اتنا تو بہرحال فائدہ ہوا ہے کہ عام
"پختونوں" میں پشتو ادب کی ترقی کا رجحان متحرک ہو گیا ہے طالب علموں نے بھی
اسے محسوس کیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ہم جو پشتو کو صرف پرائمری کی سطح تک

ہی ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہمیں انٹی پاکستانی سمجھا جاتا ہے حالانکہ یو
این او کے چارٹر میں یہ اصول زور و شور سے تسلیم کیا گیا ہے کہ بچوں کو ابتدائی
تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے چنانچہ دو چار سال قبل لندن کا ایک اخباری
نمائندہ جب ٹرائیبل پبلسٹی کے دفتر میں آیا تھا اور اس نے ایک قبائلی سے انٹرویو
لینے کا مطالبہ کیا تو وہ لوگ اسے میرے پاس لنڈی کوتل لے آئے اور اس نے مجھ
سے متعدد سوالات کئے۔ میں جواب دیتا رہا آخری سوال یہ تھا کہ آپ نے کتنی
کتابیں لکھیں میں نے بارہ تیرہ کتابوں کے نام بتائے اس نے کہا کہ فروخت کتنی
ہوئی ہیں میں نے کہا ایک فیصد اور کبھی کبھی ایک فیصد بھی نہیں۔ مسکرا کر فرمایا اس
کی وجہ۔ میں نے کہا کہ یہ آپ انگریزوں کی مہربانی ہے۔ ہنس کر کہا کیوں۔ میں نے
کہا کہ آپ لوگوں نے یہاں آ کر نہ صرف یہ کہ پختونوں میں افراتفری پیدا کی بلکہ
پشتو کو بھی نصاب تعلیم میں جگہ نہیں دی۔ ہنسے اور کہنے لگے بھائی اس وقت ہمارے
لئے یہ ضروری تھا سابق صدر محمد ایوب خان کے ساتھ پاک سپیشل جمہوریت میں
سات دن رہا۔ ہر زبان کے ادیب ساتھ تھے پشتو ادباء میں سے مجھے بلا کر شامل کیا
گیا تھا چنانچہ ایک شب کو ہم نے ڈائننگ کار میں صدر کی دعوت کی۔ اور سب سے
پہلے جمیل الدین عالی نے مجھے موقع دیا کہ میں صدر کے پاس بیٹھ کر تبادلہ خیال
کروں چنانچہ پہلے تو صدر مرحوم نے مجھ سے لنڈی کوتل کیمپ کے متعلق پوچھا
کیونکہ صدر صاحب کے بقول وہ 1962ء میں وہاں میجر کی حیثیت سے رہے تھے پھر
میں نے کہا کہ "صدر صاحب آپ فرماتے ہیں کہ ہم سب پاکستانی ایک قوم ہیں اگر
یہ صحیح ہو تو پھر ایک قوم کے لئے تعلیم کا نصاب بھی ایک جیسا ہونا چاہئے" صدر
نے کہا کہ "ٹھیک ہے" میں نے کہا "پاکستان میں نصاب تعلیم ایک جیسا نہیں سندھی
میٹرک تک ذریعہ تعلیم ہے۔ بنگالی تمام کلاسوں میں ذریعہ تعلیم ہے پنجابی پشتو اور
بلوچی کہیں ذریعہ تعلیم نہیں۔ کہنے لگے میں نے تعلیمی کمیشن مقرر کر دیا ہے ہر علاقائی
زبان کو پرائمری تک ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے اگر کمیشن نے سفارش نہ کی تو پھر مجھے

اطلاع دے دو۔

چنانچہ تعلیمی کمیشن نے سفارش بھی کی مگر اس مخفی مؤلف نے اسے خدا جانے کہاں چھپا دیا کہ پھر ایک عرصہ تک اس کا پتہ نہ چل سکا اور جب میں ایک سال کے بعد کابل گیا تو اپنے پاکستانی سفیر محمد یوسف خان سے ملنے گیا جو میرے ہم سبق رہ چکے تھے باتوں باتوں میں پختونستان اور پھر پشتو زبان کا ذکر آگیا میں نے کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ حکومت افغانستان نے اپنے آئین میں پشتو کو قومی زبان مقرر کیا ہے اور یہاں اکثر و بیشتر دکانوں کے بورڈ پشتو میں لکھے ہوئے ہیں فوجی افسروں اور محکموں کے نام پشتو میں ہیں لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ پاکستان میں افغانستان سے زیادہ پختون آباد ہیں لیکن ان زیادہ پختونوں کا حال یہ ہے کہ ان کے بچوں کو ابتداء ہی میں اپنی مادری زبان سے دور رکھا جارہا ہے چنانچہ جیسے کہ ایک انگریز دانشور نے کہا تھا کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنا ہو تو اسے اپنی زبان سے محروم کردو یہی حال ہمارا ہورہا ہے محمد یوسف خان نے اسی وقت میاں رسول رسا کو ہدایت کی جو اس وقت وہاں پریس اتاشی تھے کہ صدر ایوب کو ایک خط کا ڈرافٹ پیش کرے چنانچہ خط لکھا گیا اور تھوڑے دنوں بعد سرحد کے افسروں میں بے تحاشہ دوڑ دھوپ شروع ہوگئی صدر ایوب نے غصے سے کہا تھا میں نے پرائمری کی حد تک تمام زبانوں کو نصاب میں شامل کرانے کی منظوری دی تھی اب تک اس پر کیوں عمل نہیں کیا گیا ٹاؤن ہال پشاور میں وائس چانسلر چوہدری محمد علی مرحوم نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ ماسٹر خان گل اور دیگر بہت سے افراد موجود تھے وائس چانسلر نے کہا کہ "یہ پختونوں کا ملک ہے اس میں ضرور پشتو رائج ہوگی" یہ وائس چانسلر صاحب جتنے پشتو کے مخالف تھے ہم سب کو علم تھا مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ایک تیر بڑی تیزی سے اڑا جارہا تھا کسی نے کہا کہ اس تیز رفتاری کی وجہ کیا ہے کہا کمان کا وہ تانا جو کسی کے ہاتھ میں ہے اس نے تیر کو اڑنے پر مجبور کیا ہے پشتو کے متعلق ہمارے لنڈی کوتل کے حاجی محمد گلاب نے قومی اسمبلی میں سوال اٹھایا تھا جس پر ملنگ خان

پارلیمنٹری سیکرٹری نے کہا تھا پشتو غلطی سے اختیاری مضمون کی صورت میں آگئی ہے چونکہ انگریزوں کے زمانے میں نہ تھی اس لئے اب بھی نہیں ہونی چاہئے اور یہی کچھ حاجی گلاب کو لکھ کر جواب کے طور پر دے دیا گیا میں نے سفیر محمد یوسف کو بتا دیا لیکن پشتو زبان کے اس مخفی دشمن نے صدر ایوب کو دوسری طرف مشغول کرلیا اور پشتو کو پھر قعر گمنامی میں دھکیل دیا گیا خوشحال خان بابا نے بجا فرمایا ہے'

چا یے پلو لہ مخہ وا نخست
پختو لا مسے بکمہ پرتہ دہ

(کسی نے اس کے رخ سے تاحال نقاب نہیں اٹھایا پشتو بدستور باکرہ ہے)

تو بھائی حالت یہ ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ پشتو زبان کو دیدہ و دانستہ پسماندہ رکھا جارہا ہے اور اب ایک معجزہ ہی اسے ذریعہ تعلیم بنائے تو بنائے ورنہ اللہ ہی جانتا ہے پشتو کی یہ حالت کب تک رہے گی۔

سوال 18:- خیبر کی سنگلاخ وادی ادبی لحاظ سے بہت زرخیز ہے اور جدید دور میں اچھے اہل قلم پیدا کرنے میں آپ کی کوششوں کا بڑا دخل ہے کیا ماضی میں بھی یہ وادی ادب و شعر کا مرکز رہی ہے؟

جواب:- ہاں کسی حد تک رہی ہے اور اس سلسلے میں میرے بیٹے مراد نے ایک کتاب "د خیبر ادب" کے نام سے لکھی ہے جو عرصہ ہوا شائع ہوچکی ہے چنانچہ اس کتاب میں مراد نے خوشحال خان بابا کو بھی شامل کیا ہے کیونکہ خوشحال خان بابا نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے دوران کئی بار وادئی خیبر کے دورے کئے اس کے علاوہ میرے بڑے بھائی یار محمد خان جس کا ذکر ہوچکا ہے چار بیتہ کے شاعر تھے حاجی عمر خان بھی شاعر تھے اور وہ یار محمد خان کے دوست اور ہم عصر تھے مگر ان سب سے زیادہ مشہور طرہ باز خان شنواری تھے جو غزل کے شاعر تھے اور نوروز مرحوم کے معصر تھے رمضان کے بھی ہم عصر تھے جو ایک بڑے غزل گو پشاور شہر میں گزرے ہیں۔

طرہ باز خان کے کلام کا نمونہ بھی "د خیبر ادب" کتاب میں موجود ہے طرہ باز خان نے 1948ء میں وفات پائی عمر 75 برس کی تھی اس کے علاوہ سیدان شاہ آفریدی جو خاصہ داروں میں صوبہ دار تھے، اچھے شاعر تھے ان کے کلام کا نمونہ بھی دے دیا گیا ہے لیکن اس سے قبل تاریکی ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ ماضی میں وادی خیبر میں کون کون سے شاعر گزر چکے ہیں البتہ میرا نامی ایک مشہور شاعر جمرود میں گزر چکے ہیں جن کی قبر کا کوئی پتہ نہیں لگ سکا "د خیبر ادب" میں ان کے کلام کا نمونہ بھی موجود ہے اور اب تک صوبہ سرحد اور افغانستان کے علاقوں میں میرا کا کلام بعض لوگوں کو یاد ہے افغانستان کے ادباء نے بھی میرا کا تذکرہ کیا ہے۔

سوال 19:- پشتو کی سب سے پہلی فلم "لیلیٰ مجنوں" آپ نے لکھی رفیق غزنوی نے اسے مکمل کیا اس زمانے میں اس فلم کے نغموں کی بھی بڑی دھوم تھی وہ بھی آپ نے لکھے تھے یہ بتایئے کہ لیلیٰ مجنوں کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور آج پشتو فلمیں مقابلتاً" زیادہ کامیاب ہیں کیا وجوہات ہیں؟

جواب:- جیسا کہ گزشتہ سوال نمبر اٹھارہ کے جواب میں معلوم ہوا پشتو کو قصداً" پسماندہ رکھا جارہا ہے چنانچہ جس قدر تعلیم پختونوں نے حاصل کی ہے وہ اردو اور انگریزی کے ذریعہ کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے تحت الشعور پر اردو اور انگریزی کا تسلط رہا ہے پھر مسلسل طور پر انہوں نے اردو فلمیں دیکھی ہیں اور ہندی راگ اور گیت سنے ہیں لہٰذا ضروری تھا کہ پشتو کی طرف ان کی توجہ کا رخ نہ ہوتا خود میری یہ حالت رہی کہ ہندی راگوں کا رسیا رہا اور اب بھی ہوں اور چونکہ پختون قوم ابتداء ہی سے مختلف حملہ آوروں کی زد میں رہی ہے اور باہمی طور پر بھی لڑائیوں میں مصروف رہی ہے اس لئے اس کے شاعروں نے بھی زیادہ ترحماسی اشعار کہے ہیں دیگر اصناف پر کم ہی توجہ دی ہے پھر یہ قوم تعلیم سے محروم رہی ہے اس لئے موسیقی اور شاعری کے لحاظ سے پسماندہ رہی ہے اور جس زمانے (1941ء) میں پشتو لیلیٰ مجنوں کے گانے اور مکالمے لکھے گئے، پشتو ادب نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی آج کے دور میں کی ہے لہٰذا وہ فلم کامیاب نہ ہو سکی مگر اس کے گانے حد سے زیادہ کامیاب رہے حتیٰ کہ اب تک صدائے بازگشت سنی جاتی ہے اور بعد میں شاعروں نے لیلیٰ مجنوں کے گانوں کی طرز پر گیت لکھے چنانچہ اس فلم کا ایک گانا

کاسہ بے لیلیٰ ماتہ کمہ

بہت ہی پسند کیا گیا اس کے علاوہ "تورے لیلیٰ دیوانہ بہ شم" تو خیبر ایجنسی کی خواتین میں بھی عرصہ تک رائج رہا اور افغانستان میں تو بے حد پسند کیا گیا جسے مشہور ایکٹر ڈبلیو ایم خان نے گایا تھا اور "کاسہ ے لیلیٰ ماتہ کرہ" خود رفیق غزنوی نے گایا تھا اس کے علاوہ دیگر گیت مشہور مغنیہ حبیب خان نے گائے تھے۔

پشتو لیلیٰ مجنوں کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس فلم میں عوام کے لئے جاذب توجہ مناظر نہیں تھے نہ ان میں رقص و رنگ کا اہتمام کیا گیا تھا وجہ یہ تھی کہ رفیق غزنوی مرحوم سرمایہ دار نہیں تھے بلکہ مزدور ہی تھے اور ایک کمپنی نے انہیں اسٹوڈیو اس لئے دے دیا تھا کہ وہ اس سٹوڈیو میں کام کرتے تھے پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ رفیق ایک اچھے موسیقار ضرور تھے مگر اچھے ڈائریکٹر نہیں تھے اچھے کیا بلکہ سرے سے انہیں ڈائریکٹر نہیں کہا جا سکتا کیونکہ شوٹنگ کے دوران خود دو دفعہ میں نے انہیں ان کی غلطی پر ٹوکا جسے انہوں نے مان لیا اور میری رائے کے مطابق وہ شاٹ دوبارہ لے لیا۔ ایک تو یہ تھا کہ لیلیٰ اپنے بام کے اوپر سے نیچے مجنوں کو دیکھ کر چھلانگ لگاتی ہے اب کیمرے سے میں نے دیکھا تو اس کا صرف سینہ سے لے کر سر تک کا جسم نظر آ رہا تھا اور نیچے چند مزدور ایک بڑا سا جال لئے کھڑے تھے تاکہ لیلیٰ اوپر سے چھلانگ لگا کر گر پڑے چنانچہ میں نے رفیق سے کہا کہ بچاری کو تکلیف کیوں دیتے ہو وہ صاف کیمرے کی سافٹ سے نکل جائے اور پھر اسے نیچے زمین پر دکھایا جائے کیونکہ اس شاٹ میں تو وہ بام سے نیچے گرتی ہوئی نظر ہی نہیں آئے گی چنانچہ رفیق غزنوی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کیمرے کو لانگ شاٹ میں رکھا گیا اور پھر آدھی دیوار تک وہ گرتی ہوئی نظر آئی۔

دوسرا سین بادشاہ کا تھا جو اپنے لڑکے کی آمد کے انتظار میں ادھر ادھر بے قراری سے ٹہل رہا ہے اور جب اسے شہزادے کی آمد سے مطلع کیا گیا تو بے پروائی سے کہنے لگا اندر لے آؤ۔

میں نے رفیق سے کہہ کر کہ یہ سین بالکل غیر فطری ہے کیوں کہ وہ پہلے

اپنے لڑکے کے لئے اس قدر بے قرار تھا مگر جب اس کے آنے کی اطلاع دے دی گئی تو چاہئے تھا کہ خوش ہو کر کہتا "کہاں ہے فوراً" اندر لاؤ" اس لئے آپ بادشاہ کا ایک کلوز اپ لیں جس میں اسے اس خوشخبری پر مسرور دکھایا جائے چنانچہ رفیق غزنوی نے یہ مشورہ بھی قبول کر لیا بہرحال کچھ وجوہات اور بھی ہو سکتی ہیں لیکن پہلی فلم لیلیٰ مجنوں کامیاب نہ ہو سکی۔

سوال 20 :- کیا آپ کے خیال میں آپ کے صاحبزادے اور پشتو ادیب شاعر مراد شنواری میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کی آپ کو دلی تمنا تھی؟

جواب :- بڑی حد تک ۔ گو اس کا اپنا رنگ' انداز ہے نظم و نثر میں اچھا لکھتا ہے پشتو ایم اے بھی ہے آنرز ان پشتو بھی کرچکا ہے مگر اس کا مطالعہ میری طرح آفاقیت کا حامل نہیں اس لئے مجھے یہ بجا خوف ہے کہ وہ صرف ترقی پسند ادب ہی میں رہ جائے گا جیسا کہ اس کے رجحان سے مترشح ہے۔

میرا خیال ہے کہ ایک ادیب و شاعر کو تمام علوم و فنون کا مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ اس کا مطالعہ وسیع ہو اس کے بعد ہی وہ اپنی فطرت کے حقیقی رجحان تک نہ پہنچ سکتا ہے ابتداء میں شاعر ہمیشہ ہر نئی شے سے متاثر ہوا کرتا ہے خود میری حالت یہ رہی ہے کہ جہاں نئے افکار و خیالات مطالعہ میں آئے ان سے متاثر ہوا اور پھر اور خیالات کا مطالعہ کیا تو انہوں نے متاثر کیا اور اس طرح میں کئی بار متاثر ہوا مگر اب حالت یہ ہے کہ ادب میں جس نہجار کو اپنا چکا ہوں اور کوئی خیال مجھے متاثر نہیں کرسکتا اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "عارف کسی بات سے حیران نہیں ہوتا" یہی معاملہ اب میرے ساتھ بھی ہے کیونکہ میں نے 1923ء سے ہی مختلف علوم و فنون کا مطالعہ جاری رکھا ہے اور آج بھی یہ حال ہے کہ چار پانچ گھنٹے روزانہ مطالعہ کرتا ہوں گو اب حافظہ اچھا نہیں رہا اور جو شے پسند آجائے اسے نوٹ کرلیتا ہوں لیکن آج سے بیس برس قبل تک جو مطالعہ تھا اس کا اجمال تا حال میرے حافظہ میں موجود ہے اور میں نے کسی مضمون کے لکھتے وقت حوالے کی ضرورت نہیں کبھی البتہ کتابیں لکھتے وقت اس کی ضرورت پڑ جاتی ہے پھر مراد کے معاملہ میں حالات ایسے ہیں کہ وہ آفاقی مطالعہ کے لئے بھی وقت نہیں نکال سکتا کیونکہ وہ بہت زیادہ بال بچے دار ہے اور معاشی سرگردانی سے دوچار رہتا ہے اور یہ مراد کی خصوصیت ہے کہ ہر سال کے [illegible]

ہے ریڈیو کی ملازمت سے پیشتر وہ ملیشیاء میں حوالدار تھا اور یہ ملازمت اس کے فطری رجحان کی نفی کرتی تھی بعد میں تھوڑے پیانے پر تجارت کرنے لگا مگر یہ کام بھی اس کی طبیعت کے خلاف ثابت ہوا وہ پھر ریڈیو میں آگیا البتہ یہ کام اس کے رجحان طبع کے مطابق تھا اس کے علاوہ وہ فلمی گیت اور کہانیاں' مکالمے اور دیگر چیزیں بھی لکھتا ہے اور اس طور پر معاشی تقاضوں کو پورا کرتا ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ علمی میدان میں کوئی اہم کارنامہ انجام نہ دے سکے گا گو وہ اس قابل ضرور ہے کہ بڑے ادباء شعراء میں شمار کیا جاسکے۔

سوال 21 :- آپ کا کوئی پیغام !

جواب :- میرا پیغام عالم انسانیت کے لئے عموماً" اور پختون ملت کے لئے خصوصاً" یہ ہے کہ حیوانی جبلت کو ہمیشہ لگام میں رکھا جائے اور انسانیت کی اقدار کا تحفظ کرے ممکن ہے جب انسانیت آزاد اور خود مختار ہو اور حیوانیت کے دام سے نکل آئے تو دنیا میں امن و امان قائم ہو ۔ امن و امان ہی انسان کی حقیقی ترقی کا ضامن ہے اور بس۔

ہماری مطبوعات

سلسلہ انوار کا	(حمد و نعت)	خاطر غزنوی
داستان امیر حمزہ	(سوانح)	خاطر غزنوی
خواب در خواب	(شاعری)	خاطر غزنوی
ننھی منی نظمیں	(بچوں کے لئے نظمیں)	خاطر غزنوی
آپریشن روم	(مزاح)	زاہد میر

سنڈیکیٹ آف رائٹرز (رجسٹرڈ) پاکستان

گلی ۱۷، مکان نمبر ۳۱، گل بہار، پشاور

داستانِ امیر حمزہ شینواری

گفتگو : خاطر غزنوی